عرضِ حال

بُشریٰ اعجاز

بسم الله الرحمن الرحيم

عرضِ حال

بشریٰ اعجاز

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۵

نیاز احمد نے
این کیو پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت ۹۰/۰۰ روپے

ISBN No. 969-35-0570-0

پیاری امی کے نام

عشق ایمان

قلم ہاتھ میں پکڑے سوچ رہی ہوں کہ لب کشائی کیسے ہو۔ ابتدا کس طرح سے ہو۔ اپنی ذات کے بارے میں اعتماد کے کونسے موتی بکھیروں۔ کہ اہل دل کی نظروں میں سرخروئی پا سکوں۔ مگر افسوس کہ اپنے پاس سے سوائے "عرض حال" کی سند کے کچھ بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔ اپنا ماضی حال و مستقبل سب کچھ اسی نامہ ذات کے حصار میں بند ہو چکا ہے۔ اپنی سی بھرپور کوشش کی ہے۔ تمام جتن کئے ہیں عشق کی ریتوں کو نبھانے کے، مگر شاید بات کچھ بنی نہیں۔ بہرحال اس ضمن میں اتنا ضرور کہوں گی۔ کہ کوشش کی ہے۔ خلوص نیت سے پوری دیانتداری اور جذبے سے۔ یہ اب آپ بہتر طور پر فیصلہ کریں گے کہ میری جسارتیں کہاں تک کامیاب ٹھہری ہیں۔

اپنے بارے میں یہ عرض کرتی چلوں کہ نہ تو مجھے داستان گوئی اور قلمکاری کا دعویٰ ہے۔ اور نہ ہی میں کبھی لفظ تراشنے کے فن میں طاق تھی نہ ہوں۔ نہ ہی میرا رابطہ کبھی ادب نوازوں سے رہا اور نہ ہی کبھی ان کی خوش طبع محفلوں میں شرکت کی۔ میں تو ادب کی خوبصورت مگر کٹھن راہوں کی مسافر ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتی۔ کہ میرے علم و عمل کا دامن بہت ہی تہی ہے اور یہی تہی دامنی میرے گریز کا سبب بنی رہی۔ یہ داستان، داستان شوق، واردات قلب، ماجرائے جسم و جان ہے۔ یہ تو سر بہ سر ایک کیفیت ہے۔ وہ کیفیت جو آنکھوں کے راستے دل میں اتری۔ اور پھر نس نس میں سماتی چلی گئی۔ اس نے شہر ذات میں خود بخود اپنے نشیمن بنا لیے۔ اس نے بدن کی اندھیر نگری میں جا بجا روشنیوں کے چراغ جلا دیئے۔ وہ اجالے وہ رنگ و نور وہ روشنیاں کچھ یوں جگمگائیں ـــــ کہ میری کم علمی، میری نافہمی میری بے زبانی بھی آڑے نہ آ سکی۔ میں خطا کار، بے زبان اس الہامی کیفیت کے زیر اثر عرض حال کہتی

گئی- لفظ احساسات کے آوے سے پک پک کر نکلتے گئے- اور میں انہیں چن کر ترتیب دیتی گئی-

اس دوران عشق کی جنوں خیزیوں نے سدھ بدھ بھلائے رکھی- بارگاہ عشق میں سرخروئی کی تمنا میں شام و سحر کٹتے رہے- سنا تھا- عشق بے عمل آدمی کو باعمل اور کم سخن کو سخنور بنا دیتا ہے- تن پہ بیتی تو جانا کہ سچ سنا تھا- عشق وہ ساحر ہے- جو اپنی ساحری سے قلب و نظر کو مفتوح بنا لیتا ہے اور اس مفتوح پن میں کتنا حسن کتنا لطف کتنا سکون ہے- یہ وہی جانتے ہیں جو اس واردات سے ہو گزرے ہیں- عشق کا راستہ بڑا طویل بہت تیر آشوب اور صبر آزما ہوتا ہے- انسان بظاہر گھاٹے میں رہتا ہے- مگر ہر منافع مادی نہیں ہوتا- دوسرے پیمانے بھی ہوتے ہیں- قلب و نظر کی گہرائی کو جانچنے کے لیے عشق کی وادی پر خار سے گزرنا پڑتا ہے- عشق کی صحراؤں کی جلتی دھوپ میں تن کو جلانا پڑتا ہے- شبوں کے رت جگوں سے آنکھوں کو واسطہ پڑتا ہے- رتوں کی خموشیوں سے دل کو لگانا پڑتا ہے- پھر کہیں جا کے اس حشر سامانی دلبر جاناں عشق کا سامنا ہوتا ہے- یہی عشق کی جنوں خیزی- یہی واردات قلب عرض حال کا سبب بنی- آپ کو میری تحریر میں کہیں کہیں ترتیب کا فقدان نظر آئے گا- تو کہیں لفظوں کی کم مائیگی کا گلہ پیدا ہوگا- مگر میری تحریر و ترتیب سے میرے عشق کی گہرائی کو ناپنے مت بیٹھ جائیے گا- میرے بیان کی بے تاثیری یقیناً میری کسی سیاہی کے سبب ہوگی- مگر یہ دھیان میں رکھیے گا- کہ یہ کوئی موضوعاتی' علمی و تحقیقی تحریر نہیں- صرف عرض حال- اور عرض حال میں لفظوں سے زیادہ ماجرائے گزراں پر دھیان دیا جاتا ہے- کہنے والے کے لفظوں کی صداقت اس کے احساسات کی روشنی میں پرکھی جاتی ہے- نہ کہ اس کے گفتار کی مشاقی پر- اور پھر یہ تو نامہ ذات ہے- یہ داستان تو جان بیتی ہے- گزراں روز و شب کا قصہ ہے-

اس میں داستان گوئی اور افسانہ طرز کی گنجائش کہاں- اس میں چٹ پٹے چٹخارے دار مصالحے کی کمی ضرور ہے- مگر اس کمی کو میری کمزوری نہ جان لیجئے گا- کہ جس قلبی و روحانی واردات کا حال میں آپ تک پہنچا رہی ہوں- وہ ان رنگ برنگے لفظوں کے الٹ پھیر کی متحمل نہیں ہو سکتی- بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود میں

کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ کہ شاید اس دور میں لفظ اپنا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں۔ ان کی حرمت ان کی پاکیزگی کو اپنے اپنے طور سے اس دور کا انسان داؤ پر لگانے کا فن جان چکا ہے ان سے حسب خواہش فائدہ اٹھانے کے ہنر میں طاق ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے اپنے دل میں بھی ایک کھٹکا سا ہے۔ کہ کہیں بے اعتباری کی مجرم نہ گردانی جاؤں۔ کہیں اپنے ہی لفظوں کی صلیب پر نہ لٹکا دی جاؤں۔ یہی سوچ میری کم سخنی کی موجب بنی ہے۔ مگر مجھے اہل دل اہل ذوق سے یہ امید ضرور ہے کہ وہ میرے مختصر ادھورے لفظوں سے میری سچائیوں کے اصل چہروں کی کھوج ضرور لگا لیں گے کہ وہ بڑے ماہر نباض اور حقیقت شناس ہیں۔ عرض حال سننے والوں سے میری درخواست ہے کہ زبان و بیاں کی تمام تر کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود یہ فقط عرض حال ہے۔ میرا آپ کا ہم سب کا عرض حال' لہٰذا اس کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اسے دل سے سنئے گا اور روح میں رکھیے گا۔ اگر آپ نے اس کے درد کو محسوس کر لیا تو جانئے اس مقصد کی تکمیل ہو گئی۔ جو اس کا سبب تھا۔

اور اب آخر میں میری دعاؤں کے دامن وا ہیں۔ ان مہربانوں کے لیے جنہوں نے اس سلسلے میں میری راہنمائی کی اور مجھے میرے مقصد تک پہنچانے میں میرے معاون و مددگار رہے۔

عشق دی بھاہ ہڈاں دا بالن عاشق بیہہ سیند لے ہو
گھت کے جان جگر وچ آرادانگ کباب تلیندے ہو
سر گردان پھرن ہر ویلے خون جگر دا پیندے ہو
ہوئے ہزاراں عاشق باہو پر عشق نصیب کہندے ہو

بشریٰ اعجاز

لاہور ——

میں تاں ڈھوک پنن دی جانا

لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک
ان الحمد و انعمتہ لک والملک لا شریک لک

میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آنسو پتہ نہیں کب سے بہہ رہے تھے زندگی پوری حسیات کے ساتھ مجھ میں زندہ ہو گئی تھی۔ ماحول کیا تھا اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ جسم و جان کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں اور کانوں میں اتر آئی تھیں۔ کان جو لبیک کا نعرۂ حیات آفریں سن رہے تھے۔ ان مبارک اور مقدس بولوں کو جو ہماری روح و ایمان کی پہچان و ضرورت ہیں۔ جو ہمارا پروردگار سے ازل سے لے کر ابد تک قائم رہنے والا عہد ہے۔ ہماری روحوں نے آسمانوں پر جو عہد کیا تھا اس لبیک کی صدا پر لبیک کہا تھا جو حضرت (ابراہیم علیہ اسلام) نے کہی تھی۔ وہ روحوں کی صدا' اس وقت کی ہے جب ان فانی جسموں کی شناخت بھی نہ بن پائی تھی۔ اس ازل سے کئے ہوئے عہد و اقرار کا اعادہ جسم کی قید میں جکڑی ہوئی روح پوری شدت سے کر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی لبیک اللھم لبیک پوری شدت سے۔ بڑے جوش و ولولے سے یہ لفظ میرے منہ سے یوں ادا ہوئے کہ میں خود ہی چونک پڑی۔ ایک اجنبی آواز' مگر مضبوط و مقبول لہجہ' اپنی آواز کے اجنبی لہجے پر میں خود ہی حیران رہ گئی۔ ٹی وی پر وقوف عرفات شروع ہو چکا تھا۔ میں ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھی زندگی کا انوکھا پیغام سن رہی تھی۔ جو جسم و جان کی ضرورت تھا۔ بچے پاس ہی بیٹھے کھیل رہے تھے۔ گاہے گاہے بے دلی سے ٹی وی دیکھتے اور پھر جلد ہی اکتا کر اپنے کھیل میں مگن ہو جاتے آخر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا' یہ کیا امی؟ اتنے بہت سے لوگ' بسوں پر چڑھ کر کہاں جا رہے ہیں۔ انہوں نے ایک جیسے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟

اور یہ اتنے زور زور سے ایک ہی سبق بار بار کیوں دہرا رہے ہیں۔ ایک ہی سانس میں یک زبان ہو کر بچوں نے کئی سوال اگل دیئے اور میں ان کے پے در پے سوالات سن کر گنگ رہ گئی۔ اوہ میرے خدا! اپنی لاپرواہی' شرمندگی بن کر مجھ پر چھانے لگی' کیسی ماں ہوں میں' کیسا اسلام ہے مجھ میں' کہ میرے بچے اتنے اہم حالات سے ناواقف ہیں۔ اپنی پہچان سے بے خبر ہیں' اپنی کوتاہی پر پشیمانی ہونے لگی۔ صرف ماں بننا تو شاید آسان کام ہے مگر ایک مسلمان ماں بن کر بچوں کی ذہنی' جسمانی نشو و نما احسن طریقہ سے کرنا مشکل ترین مگر خوبصورت ترین عمل ہے۔ مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر عبدالرحمٰن بولا امی آپ نے ہماری باتوں کا جواب نہیں دیا۔ آپ چپ کیوں ہو گئیں۔ اس بچے کی سوال پوچھنے والی عادت سے میں شروع ہی سے بہت کتراتی تھی کیونکہ ایک کے بعد ایک سوالات کا سلسلہ یوں دراز ہوتا کہ آخر کار میں تھک کر چپ ہو جاتی مگر اس کی تشنگی نہ مٹتی تھی۔ جانے کیسا کھوجی ذہن اس بچے کا ہے۔ میں چڑ کر سوچتی۔ مگر اس وقت اپنا کترانا اور بچے کے سوالات سے دامن بچانا بھی مجھے بہت بڑا جرم محسوس ہوا اپنی لا پرواہی کے نتائج سامنے آ گئے تھے۔ مگر ان کی تلافی ممکن تھی۔ بیٹے' میں نے معمول کے خلاف اسے پیار سے پاس بٹھایا اور کہنے لگی۔ آپ تو جانتے ہیں ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا مذہب اسلام ہے اور اسلام کے پانچ ارکان ہیں جن کا آپ کو پتہ ہے۔ جی امی میں جانتا ہوں اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ کلمہ' نماز' روزہ' زکوۃ' اور حج۔ اس نے ایک سانس میں سب کچھ سنا دیا۔ شاباش۔ تو بیٹے ان ارکان میں ایک بڑا اہم رکن حج ہے جو کہ ذوالحجہ کے اسلامی مہینے میں ہوتا ہے۔ مکہ میں اللہ کا گھر یعنی کعتبہ اللہ ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔ جی امی۔ میں جانتا ہوں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی کوتاہی پر افسوس اور بچے کی ذہانت پر رشک سا محسوس ہوا۔ کعتبہ اللہ جسے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور ان کے بعد اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ اسلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ اسلام کے ساتھ مل کر از سرنو تعمیر کیا اللہ کا یہ مقدس گھر شروع ہی سے بڑی شان والا ہے۔ اسلام سے پہلے کافر اس گھر میں عبادت کرتے تھے طواف کرتے تھے اسلام آنے کے بعد خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا گیا۔ اور پھر اصل و حقیقی جذبات و روایات کے ساتھ یہاں

عبادت کی جانے لگی۔ پھر تو میں نے پورے جوش کے ساتھ بچے کو تمام تاریخی معلومات دیں۔ لوگوں کے لباس کے بارے میں بتایا گیا۔ یہ دو چادریں جو مردوں نے جسم کے گرد لپیٹ رکھی ہیں انہیں احرام کہتے ہیں۔ یہ ہمارے نبی پاکؐ کی سنت ہے پھر میں نے بچوں کو لبیک کا مطلب بتایا۔ بچے بڑے انہماک سے باتیں سن رہے تھے اور میں پورے جذبے کے ساتھ انہیں بتا رہی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا لوگ میدان حشر میں ادھر سے ادھر آنے جانے میں مشغول تھے' کوئی چھتری تھامے تھا کوئی ننگے سر مزے سے دھوپ میں چل رہا تھا' تمام انسان اس عالم میں کوئی مافوق الفطرت شئے نظر آ رہے تھے۔ میں حیرت سے ان جذبوں کے سفیروں کو دیکھ رہی تھی۔ اتنی شدید گرمی میں جبکہ یہاں اندر کمرے میں پنکھے کے نیچے پسینہ برا حال کر رہا تھا۔ تو وہاں اس کھلے میدان میں، تپتی دھوپ میں لوگ کیسے پھر رہے ہیں۔ کیا انہیں گرمی نہیں لگتی' مگر شاید میں یہ نہ جانتی تھی کہ جذبے جب ایمان کے حیات افروز شربت سے بھر جاتے ہیں تو پیمانے یوں ہی چھلکتے ہیں' جذبہ ایمانی جب شوق کی ان راہوں کی طرف چلتا ہے۔ تو دھوپ ٹھنڈا گھنا سایہ بن جاتی ہے اور چٹیل پتھروں والا میدان ریشمیں نرم و ملائم قالین کی مانند لگتا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے جذبوں اور شوق کے قصے ہیں۔ جب جذبے اپنی سچائی کی طرف لوٹتے ہیں تو انسان ایک ایسی قوت بن جاتا ہے۔ جسے دیکھ کر دیدۂ بینا حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ ایک مسلمان اپنے اندر اتنی باطنی طاقتیں رکھتا ہے کہ ظاہر اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں سکتے کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ ایمان کا زور' روح کی سچائیاں اور حقیقتوں کے رنگ' میرا جسم کانپ رہا تھا۔ سماعت سے لبیک کی صدائیں ٹکرا رہی تھیں۔ کچھ بھی باقی نہ رہا تھا' کوئی احساس بھی سوائے اس احساس کے زندہ نہ تھا۔ کہ میں روشنی کو انسانوں کے روپ میں متحرک دیکھ رہی تھی' پھر نہ جانے کیا ہوا محرومی کا احساس میرے تن بدن پہ چھانے لگا۔ اس سے پہلے گزری حیات اک سعی لاحصل اور بیکار خرابے کی صورت نگاہوں میں پھرنے لگی۔ اپنا وجود بے مصرف نظر آنے لگا۔ ذہن و دل میں لبیک کچھ یوں سرایت کر گیا کہ میں خود کو محبوس تصور کرنے لگی۔ اک اندھیری کال کوٹھری میں بند ایک قیدی کی طرح جس کے ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں۔ اور زبان پہ خوف

ے پہرے۔ وہ چپ چاپ نہ چاہتے ہوئے بھی قید خانہ میں دن گزارنے پر مجبور ہوت ہے، نہ تو وہ اپنی مرضی سے حرکت کر سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے بشری تقاضے پورے کر سکتا ہے کیونکہ وہ ایک قیدی ہے اور قیدی کا مرضی سے کیا تعلق، وہ تو حکم کا غلام ہوتا ہے۔ نہیں نہیں میرا دل پوری شدت سے چیخ اٹھا۔ میں سب زنجیریں توڑ دوں گا۔ تمام بیڑیاں کاٹ ڈالوں گا۔ اس جہاں کی اندھیری کال کوٹھڑی سے نکل کر لبیک کے جہاں میں کھو جاؤں گا کیونکہ میری حقیقت وہی ہے۔ روشنی وہی ہے۔ سچائی وہی ہے میں آ رہی ہوں، اے اللہ میں آ رہی ہوں، تیری حاضری کو، اپنے تن بدن کے ساتھ، جسم و دل کے ساتھ، روح کی تمام سچائیوں کے ساتھ۔ میرا مقام اول مقام آخر وہی ہے۔ میرا دوام میرا قرار وہی ہے۔ میں خواہشوں کی کال کوٹھڑی کی قیدی تھی۔ میں نے روح و دل کی سچائیوں سے آنکھیں موڑ کر خود کو خواہشوں کا غلام بنا لیا تھا۔ مگر صد احسان تیرا کہ تو نے مجھے لاعلمی کی قید سے نجات دلائی، مجھے حقیقتوں کی روشنی سے باخبر کیا۔ میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں۔ میری زبان سے آپ ہی آپ لبیک لبیک کے ترانے نکل رہے تھے۔ میں آس پاس سے بے خبر کیے جا رہی تھی جانے لبیک کے بولوں نے میرے ٹھنڈے ٹھار بے حس و حرکت جذبوں کو ایمان کی کیسی حرارت پہنچائی تھی کہ وہ سلگ رہے تھے ظلمتوں کو سمیٹ رہے تھے۔ اجالوں کو پھیلا رہے تھے۔ ہر طرف نور ہی نور، اجالا ہی اجالا، ظلمتیں مٹ گئیں۔ روشنیاں چھا گئیں۔

* * *

مینوں لگڑا عشق اولڑا
اول دا' روز ازل دا

یہ ۱۹۸۳ء کی بات تھی' پھر اس کے بعد میں دل اپنے قابو نہ رہا۔ روح پر ہر وقت ایک بوجھ سا طاری رہتا' دل کی بے قراری میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا زندگی میں جو ٹھہراؤ تھا کہیں گم ہو کر رہ گیا۔ ہر وقت طوفان' ہر گھڑی ڈوبنے کا ڈر' دل کی نیا طوفانوں میں گھری ڈولتی ڈگمگاتی رہی خیالات کے صنم خانے میں دل انہی مبارک گھڑیوں کو تراشتا رہتا۔ جب قافلے دیار حبیب کو چلیں گے جب ارض مقدس کی ہواؤں کے دوش بدوش چلتے اس خاک کو پیشانی کی زینت بنا سکوں گی۔ جس کے لیے ایک عرصہ سے روح تڑپتی ہے۔ مگر سوچنے سے کیا ہوتا ہے وقت گزر رہا تھا۔ وقت کو تو گزرنا تھا وہ بھلا اک دل جلی کی خاطر کیوں ٹھہرتا۔ لہٰذا وہ گزرتا رہا۔ زندگی لمحہ لمحہ قطرہ قطرہ بیت رہی تھی۔ عمر کا موسم ہولے ہولے فنا کی منزلوں کی جانب رواں دواں تھا۔ حج کی درخواستوں کے دن قریب آ رہے تھے۔ میری تڑپ دید کے قابل تھی۔ مگر بظاہر جانے کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے اعجاز سے پوچھنے کی ہمت کی کیونکہ وہ میرے شوق سے تقریباً لا علم ہی تھے۔ کبھی کبھی پیش بندی کے طور پر اشارۃً کہہ دیتی اس سال تو میں بھی حج کے لیے جاؤں گی۔ بھیجیں گے نا؟

اور اعجاز میری لا ابالی طبیعت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ دیتے ضرور بھیجوں گا۔ مگر فی الحال نہیں۔ اور ان کی یہ نہیں ایک بہت بڑا سوال بن کر نا امیدی کی صورت میرے سامنے آن کھڑی ہوتی میرے ارادے میرے ولولے ریت کی دیواروں کی طرح گرنے لگتے۔ حوصلوں کے بادبان سمٹنے لگتے مگر دوسرے ہی لمحے لبیک کی صدا میرے ارادوں اور حوصلوں کو نئے عزم اور امید سے کھڑا کر دیتی۔ میں نئے سرے سے

ایک نئی لگن سے اُمیدوں کا دامن تھام لیتی۔ ایسا بارہا ہوا۔ جب بھی میں نے حج کا ذکر چھیڑا تو سب نے بات ہنسی میں اڑا دی۔ اعجاز ہنس کر مجھے چڑاتے ہوئے کہتے اچھا تو آپ حج کے لیے جانا چاہتی ہیں۔ بھئی ابھی جلدی کیا ہے۔ تھوڑے بال سفید ہو جانے دو پھر اکٹھے ہی جائینگے۔ ابھی تو آپ کے کھیلنے کودنے کی عمر ہے ابھی سے یہ بوڑھوں والے شوق نہ پالیے لور میں ان ستم ظریفیوں پر ہنس بھی نہ سکتی۔ پھر تو ایسا ہوا کہ میرا حج پر جانا لوگوں میں ایک موضوع بن گیا۔ جب بھی حج کا نام لیتی کوئی نہ کوئی نیا فقرہ سننے میں آتا۔ طرح طرح کے لوگ قسم قسم کی بولیاں۔ ایک مہربان فرمانے لگے بھئی پہلے نو سو چوہے پورے کر لو پھر حج کے لیے جانا۔ ابھی میں اس وار سے سنبھل بھی نہ سکی تھی کہ اس کے جواب میں ایک اور ارشاد ہوا۔ آپ کو کیا معلوم شاید پورے ہو چکے ہوں۔ یا خداوند یہ تیرا کیسا جہاں ہے۔ کہ تیرے پاس آنا بھی جرم میں شامل ہے۔ جب طرح طرح کی بولیوں اور پریشاں سوچوں سے گھبرا جاتی تو خدا سے گلے شکوے شروع کر دیتی آخر ایک دن تقدیر کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ تمام دن سوچتی رہی لفظ چنتی رہی۔ اعجاز سے فیصلہ کن بات کرنے کے لیے موزوں وقت کا انتظار کرنے لگی۔ کیونکہ درخواستیں دینے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اور میں ہنوز وہیں تھی جہاں سے ابتدا کی تھی ابھی تو ایک انچ بھی منزل کی جانب پاؤں نہ بڑھے تھے۔ شوق تھا کہ دیوانہ کئے ہوئے تھا اور راہ کی مشکلیں شوق کو ناامیدی کے برف خانے میں بند کرنے پر آمادہ نظر آتی تھیں۔ آخر طویل کشمکش کے بعد ایک مناسب موقع دیکھ کر میں نے اعجاز سے بات کر ہی لی۔ چن چن کر لفظ نکالے۔ سو سو طرح کی تمہیدیں باندھیں اور اپنی بات منوانے کے لیے ساری لفاظی استعمال کر ڈالی۔ لفظوں نے جذبوں کی ترجمانی کا کام خوب سرانجام دیا۔ میں بے تکان بولتی رہی اور اعجاز چپ چاپ سنتے رہے میری نان شاپ اسپیڈ دیکھ کر دفعتاً” بولے کچھ مجھے بھی بولنے کا موقع ملے گا کہ ابھی اور انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے بوکھلا کر اعجاز کو دیکھا اور چپ سادھ لی۔ انہوں نے میری تمام باتوں کے جواب میں اپنا سابقہ فیصلہ سنا دیا کہ سارے کام وقت پر اچھے لگتے ہیں۔ ابھی نہ تو تمہارے حج پر جانے کا وقت ہے اور نہ ہی تمہارے فرائض تمہیں یہ اجازت دیں گے کہ تم جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ تمہارے

بغیر کیسے رہیں گے۔ مگر اعجاز بچوں کے پاس آپ جو ہوں گے۔ میں نے ایک دم تمام راہیں مسدود دیکھیں تو رو دینے والے انداز میں کہا۔ بھئی میں تو ٹھہرا پردیسی آج یہاں کل وہاں میرا مستقل ٹھکانہ تو تم جانتی ہو کہیں نہیں ہے ایسے حالات میں' میں بچوں کے پاس کیسے رہ سکتا ہوں اور اگر فرض کرو میں بحالت مجبوری ان کے پاس رہوں بھی تو بچے میرے پاس خوش رہیں گے' انہوں نے شان بے نیازی سے میری تمام کوششوں کو نہیں کی نکیل ڈال کر ناامیدی کے کھونٹے سے باندھ دیا' اعجاز سوچیں تو' ایک ہی ماہ کی تو بات ہے کیا آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے میرے لیے' اب میں منتوں پر اتر آئی تھی۔ اعجاز ایک لمحے کے لیے گڑبڑا سے گئے پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے' دیکھو تم خواہ مخواہ اصرار کر کے اس بات کو اپنے اور میرے لیے مسئلہ بنا رہی ہو ابھی اس عمر میں تمہیں جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے تمام عمر پڑی ہے پھر چلی جانا۔ ابھی رک جاؤ تو بہتر ہے۔ اس بات کے جواب میں' میں ان سے کیا کہتی۔ ان کو کیسے بتاتی' کہ عمر کا ریشم کتنا بے بھروسہ ہوتا ہے چلتا جائے تو چلتا جائے مگر الجھ جائے تو ایک دم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور پھر جلدی کی بات تو شاید میری بھی سمجھ سے باہر تھی۔ انہیں کیسے سمجھاتی کہ پاؤں کے نیچے زمین ہر وقت جلتی رہتی ہے اور یہ جلن تن من سلگائے رکھتی ہے' شاید یہ آگ وہاں جا کر بجھ سکے۔ کیوں پھر کیا خیال ہے۔ انہوں نے مجھے گم سم دیکھ کر' کہا۔ نہیں اعجاز مجھے جانے دیں۔ بس میری آخری ضد سمجھ کر مان لیں۔ پھر کبھی کوئی ضد نہ کروں گی۔ میرا وعدہ ہے' خیر یہ بات تو آپ نہ کہیں کیونکہ ہر دفعہ ہی آپ کی ضد آخری ہوتی ہے یہ اور بات کہ آخری ضد ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے ٹھیک ہے اگر یہ تمہاری آخری ضد ہے تو میں ایک شرط پر مانتا ہوں۔ کیا؟ میرا بجھا بجھا لہجہ چمک اٹھا۔ بتایئے میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا شرط یہ ہے کہ تمہارے ساتھ امی ضرور جائیں گی اور محرم بھی نام نہاد نہ ہوگا۔ کیا مطلب؟ یعنی جیسا کہ ہمارے ہاں رواج ہے' عام طور پر عورتیں اپنے ان محرموں کے ساتھ بھی حج پر جاتی ہیں جن کی شکل تو کجا ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتیں اور اگر ان سے اس کا سبب پوچھا جائے تو جواب میں ارشاد ہوتا ہے' بھئی حج کا سفر ہے اور اس نیک فرض کی ادائیگی کسی بھی صورت میں جائز ہے اس میں یہ ضروری نہیں کہ محرم وہی ہو

جو کہ حقیقتاً بھی محرم ہو۔ سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اب کوئی محرم ساتھ نہ چلے تو کیا ہم حج نہ کریں۔ اعجاز نے پوری تفصیل سے اپنی شرط بیان کی تو میں بجھ کر رہ گئی۔ امی کے ارادے کا تو مجھے پتہ تھا۔ وہ دوسری دفعہ حج کے لیے جانا چاہتی تھیں۔ مگر محرم کا مسئلہ پوری طرح میرے ذہن میں نہ تھا اور شاید یہی ایک کمزور پہلو جان کر اعجاز نے پورے اعتماد سے بات کی تھی۔ اب ان کی شرط پوری سنگینی سے میرے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ خیر اللہ بھلی کرے گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا، میرا دست سوال تو اللہ کے سامنے دراز تھا۔ میں اعجاز سے بات کرنے کے بعد امی سے بات کرنے کے لیے سرگودھا پہنچی، ان کو سارا قصہ سنایا اور اعجاز کی شرط کی بابت بھی بتلایا، امی جو ایک سال پہلے فریضہ حج ادا کر چکی تھیں اب دوبارہ جانے کے ارادے سے زاد راہ جوڑے بیٹھی تھیں مجھ سے بھی زیادہ بے تاب تھیں انہوں نے مجھے تسلی دی۔ مجھے ہمت دی کیونکہ میں خود کو بہت زیادہ شکستہ محسوس کر رہی تھی، جانے ارض مقدس کی لگن نے مجھے کیا کر ڈالا تھا۔ ہر لحظہ خود کو بندھا بندھا محسوس کرتی ان دیکھی رکاوٹیں۔ بے بہا کوششیں، شوق تھا کہ کھینچے لیے جا رہا تھا۔ بدنصیبی تھی کہ باندھے چلی جا رہی تھی۔ میں ان جذبوں کے بیچ لٹکتی، سوائے دعا کے اور کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ امی کے حوصلوں نے کچھ سہارا دیا یا شاید اپنے ہی جیسا جذبوں کا مارا اک ہم نفس ملنے سے کچھ قرار سا آگیا تھا۔ امی پوری تگ و دو سے جانے کی کوششوں میں لگ گئیں اور میں دل میں امید کی شمعیں فروزاں کئے ہوئے واپس گھر آگئی۔ عشاء کی نماز حسب معمول پڑھی۔ عشاء کی نماز عام طور پر میں دیر سے ادا کرتی ہوں۔ یہ میری عادت ہے، ایک احساس کہ اس تنہائی اور سناٹے میں اللہ بہت قریب ہوتا ہے رگ جان سے بھی نزدیک۔ اس وقت تقویت پکڑ جاتا ہے، دل میں چھپی ہوئی بے شمار حسرتیں، خواہشیں، دعاؤں کے دامن اوڑھ کر خدا کے حضور پیش ہو جاتیں ہیں دل کھول کر مانگنے کا لطف آجاتا ہے سارے بوجھ ساری اذیتیں کہیں دور بھاگ جاتیں ہیں، اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ عشاء کی نماز پڑھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، ہاتھ اٹھے تو دعاؤں کے دامن پھیل گئے اپنی نامرادیاں، حسرتیں، بے شمار ننھے ننھے قطروں کی شکل میں نیچے گرنے لگیں مجھے سدھ نہ رہی میں کہاں ہوں پتہ نہیں

کب اٹھے ہوئے ہاتھ ٹوٹی شاخوں کی طرح گر گئے اور میں سجدے میں گر پڑی، جانے کیا کیا مانگا اس دینے والے سے کچھ یاد نہیں، مگر شاید اس لمحے اس نے میری تقدیر میں ایسا کچھ رقم کر دیا جسے بظاہر میری آنکھیں دیکھ نہ سکیں۔ حج کی درخواستوں کے دن آ گئے، میں امی کی طرف سے ملنے والی اطلاع کی منتظر تھی، بہت دن گزر گئے امی کی طرف سے کوئی اطلاع نہ آئی، کھانا پینا، سونا جاگنا سب چھوٹ گیا بھوک پیاس جیسے اڑ گئی تھی۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کوئے مدینہ، سوئے حرم، ایک ہی لگن، ایک ہی شوق، ایک ہی جذبہ، میں ان زور آور جذبوں کے آگے بے بس ہوئی جا رہی تھی، پتہ نہیں قدرت کو کیا منظور ہے۔ بے بسی سے سوچتی، اعجاز سے بھی اس مسئلہ پر کوئی بات نہ کر سکتی تھی، کہ مبادا میرے بات کرنے سے وہ اپنا ارادہ نہ بدل لیں، پھر انہیں کوئی نیا خیال نہ سوجھ جائے ابھی تو وہ شرط والی پخ نکال کر مطمئن بیٹھے ہیں پھر کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا کر دیں۔ لہٰذا جو کچھ بھی تھا دل میں تھا۔ ایک دن اطلاع مل ہی گئی۔ جس کا لب لباب یہ تھا، کہ جن بھائی، یعنی "محرم" کا پروگرام تھا حج کے لیے جانے کا وہ اس سال کسی وجہ سے نہیں جا سکتے لہٰذا اب اگلے سال دیکھا جائے گا۔ اطلاع کی ناامیدی نے مجھے بے بس کر دیا۔ ساری امیدیں، حوصلے، ولولے مٹی کا ڈھیر بن گئے ناامیدیاں دل میں ڈیرے جمانے لگیں۔ اپنے شوق اور ارادے جیسے خود سے شرمندہ ہو گئے ایک چپ سی لگ گئی، دل کے اندر باہر، اک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ دور بہت دور امیدوں اور ناامیدیوں کے درمیان شوق کی منزل کے آثار مٹتے بنتے نظروں سے اوجھل ہو گئے، دیار حبیب کی آس، سوئے حرم کی چاہت روح کے ویرانوں میں اتر کر دل کا بوجھ بن گئی۔ زندگی جو پہلے بڑی مکمل بڑی بھرپور تھی۔ اب خالی خالی ادھوری سی لگنے لگی وہ خواب جو حجاز مقدس کا گنہگار آنکھوں نے دیکھا تھا۔ تعبیر کی سنگلاخ چٹانوں میں بھٹکتا رہ گیا اور میں حجاز مقدس کے قافلوں کی روانگی اور آمد کے مناظر دل کو پکڑے دیکھتی رہ گئی۔ قطرہ قطرہ ہولے ہولے وقت بیتتا رہا اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کا سفر جاری و ساری تھا۔ سردیوں کی چھٹیوں میں سرگودھا جانا ہوا۔ رات کو ہم ماں بیٹی حسب سابق اکیلی بیٹھ گئیں۔ وہی عشق کے جھگڑے وہی چاہتوں کی چبھن دل میں تڑپنے لگی۔ سب موضوع سارے قصے کہیں گم ہو گئے۔ وہی روز اول

کا عشق' وہی نارسائیوں کے قصے' میں نے تنہائی ملتے ہی امی سے پوچھا۔ امی' کیا ارادہ ہے آپ کا اس دفعہ۔ کونسا ارادہ بیٹے۔ امی نے جواب دیا اور ان کے اس جواب نے مجھے ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔ حج کے بارے میں پوچھا ہے امی' میں جیسے ریت کا ڈھیر بن گئی تھی خود اپنے آپ سے ڈرتی ہوئی جواب کے انتظار کی سولی پر لٹک گئی۔ حج کا ارادہ انشاء اللہ پکا ہے۔ اللہ کو منظور ہوا تو اس سال جائیں گے۔ امی کے لہجے کے یقین اور لفظوں کی خوبصورتی نے مجھے زندہ کر دیا' سچ امی' میں جی اٹھی۔ انشاء اللہ بیٹے۔ امی کے لہجے اور لفظوں میں پتہ نہیں کیسی قوت تھی کہ مجھے ایسا لگا کہ کوئی بھی مشکل کوئی بھی رکاوٹ نہیں۔ وہ رکاوٹیں' نا امیدیاں تو سب خام خیال تھیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ درمیان میں آنے والے لمحے شاید اک خواب تھے۔ جو پل بھر کو آئے اور پریشان کر گئے۔ آنکھیں کھلنے پر سامنے حقیقتیں اپنے خوبصورت لباس میں کھڑی استقبال کر رہی تھیں۔ نجانے امی کے لہجے نے کیا کر ڈالا تھا۔ میں یکسر بھول گئی کہ ابھی تو امی کی اور میری بات ہی ہوئی ہے اور بات تو پچھلے برس بھی ہوئی تھی مگر ہم نہ جا سکے کیونکہ محرم کا مسئلہ درپیش تھا اور وہ مسئلہ اب بھی پوری حقیقت کے ساتھ ہمارے سامنے تھا اور یہ بھی کہ ابھی تو پتہ نہیں کتنے مرحلے ہیں جن سے گزرنا ہے جانے آگے کیا ہو —— امی کے اعتماد اور لہجے کی مضبوطی نے میرے چہار طرف رنگ ہی رنگ' خوشبو ہی خوشبو بکھرا دی۔ میری ٹوٹی آسیں نئے سرے سے جڑنے لگیں۔ میری کھوئی منزلوں کے نشان پوری آب و تاب سے واضح ہونے لگے۔ اس مالک نے جذبے دیئے تو ان کی حرمت کے پاس بھی رکھ لیے۔ اس کی رحمتیں اس قدر اچانک برسنے لگیں کہ میں دم بخود رہ گئی۔ منزلوں کے شوق بخشنے والا منزلیں بخشنے کی قدرتیں بھی رکھتا ہے۔ ہمارے حیلے تو اس کے وسیلے کے مرہون منت ہوتے ہیں اور اگر وسیلہ اس کا مل جائے تو اور کیا چاہیے۔ ساری مشکلیں نظر کا فریب تھیں۔ حقیقتاً کچھ بھی نہ تھا۔ نہ زاد راہ کا بہانہ' نہ محرم کا مسئلہ' نہ اجازتوں کی مشکل' یہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ منزل بڑی واضح بڑی قریب تھی یہ ہماری اپنی ہی کوتاہ نظری تھی کہ کچھ دکھائی نہ دیا۔ محرم تو ہمارے اپنے گھر میں موجود تھا ہم کسے کھوجتے رہے' ہوا یوں کہ میرے پھوپھی زاد بھائی جو کہ میرے بہنوئی بھی ہیں جن کا پہلے حج کا کوئی ارادہ نہ تھا بیٹھے بٹھائے حج کے لیے تیار ہو

گئے۔ مع ہماری باجی صاحبہ کے اور یوں ایک بنا بنایا محرم بغیر کھوج کے اللہ نے دے دیا اللہ کی رحمتیں پل پل اس کے غفور الرحیم ہونے کا احساس دلاتی ہیں ہر لحظہ اس کے قریب ہونے کی شہادت دیتی ہیں وہ ہمارے پاس ہے ہمیں ہر لمحہ ہر گھڑی دیکھتا۔ ہمارا خیال رکھتا‘ گزرتی اذیتیں اب ایک خواب و خیال کی مانند لگ رہی تھیں۔ شاید وہ ایک آزمائش تھی جو ہمیں آزمانے کی خاطر ہم پر آئی تھی اور شاید یہی آزمائش ہماری نجات بن گئی تھی۔ سب مسئلے ایک دکھاوا بن کر رہ گئے۔ اعجاز کی اجازت کا مسئلہ جیسے میرا اپنا پیدا کردہ تھا۔ کیونکہ جب ان سے فائنل پوچھا گیا تو انہوں نے مجھے بخوشی اجازت دے دی اور یوں وہ مسئلے جو اک روگ بن کر ذہن و دل سے چمٹ گئے تھے محض پریشان خیالی بن کر رہ گئے۔

***

میں اڈیکاں کر رہی

اب وہ تو سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ مگر جانے کا سلسلہ ابھی شروع بھی نہ ہوا تھا۔ ریگولر درخواستیں شروع ہو چکی تھیں، چونکہ ریگولر درخواستوں میں قرعہ اندازی ہوتی ہے ہم قرعہ اندازی کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ اس لیے باہم مشورے سے سب نے سپانسر شپ کی درخواستوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ہمارے ایک عزیز جن کی رہائش جدہ میں ہے، انہوں نے یہ مسئلہ لمحوں میں حل کر دیا ان کو ڈرافٹوں کے بارے میں ٹیلیفون پہ بتایا۔ وہ جیسے تیار بیٹھے تھے انہوں نے ہمیں مکمل یقین دلایا کہ بہت جلد ڈرافٹ لے کر وہ خود پاکستان آ رہے ہیں آپ بس یوں سمجھئے کہ آپ کی درخواست ہو گئی، گو ان کے لفظ بڑے واضح تھے مگر نا امیدیوں سے خوف زدہ دل اب کسی بھی نئی مشکل کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اک دھڑکا سا دل کو لگ گیا۔ پتہ نہیں لمحے اب کونسا نیا تماشا دکھانے والے تھے۔ ان کی آغوش میں پھول تھے یا کانٹے کوئی کیا جانے۔ ڈرافٹوں کا انتظار زندگی کا سب سے بڑا احساس بن گیا۔ ہر گھڑی بیل کی آواز پر کان لگے رہتے ہر دوسرے تیسرے دن فون پر امی سے بات کر لیتی۔ انتظار بڑھ رہا تھا اور صبر کا دامن سمٹنے کو تیار تھا۔ تاریخ پر تاریخ گزرتی جا رہی تھی۔ دو تین دن امی نے فون نہ کیا تو اک دھڑکا سا لگ گیا۔ میں جو یہاں ڈرافٹ کے انتظار میں آس کے دیئے جلائے بیٹھی ہوں ہر ہر آہٹ پر کان لگائے، کہیں پھر نا امیدی کا کوئی نیا کھیل نہ شروع ہو جائے۔ کہیں امی کا ارادہ تو نہیں بدل گیا۔ قاسم بھائی ضرور پروگرام خراب کر بیٹھے ہوں گے۔ اتنی جلدی بے سوچے سمجھے تیار ہو بیٹھے تھے، اب حالات کا جائزہ لیا ہو گا۔ اگر.... اگر ایسا ممکن ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اور یہ کیا، مجھے پریشان کرنے لگی نہیں نہیں خداوندا اب میرے ظرف کا امتحان نہ لینا۔ میں تو پہلے ہی چور چور بیٹھی

ہوں اب اور مجھے آزمایا تو مر جاؤں گی۔ پتہ نہیں وہ لگن کی کونسی منزل تھی۔ جہاں میری جان اٹکی ہوئی تھی۔ اگر کچھ نظر آتا تھا تو ارض مقدس باقی سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ دل و دماغ کے اندر ہر وقت ایک بے چینی چھائی رہتی۔ اس کشمکش میں کچھ دن اور سرک گئے۔ میں اپنے ہی خدشوں اور وسوسوں سے لڑتی بے حال ہو گئی تو ڈرتے ڈرتے سرگودھا فون کرنے کی ٹھانی۔ یوں جیسے کوئی مجرم فیصلہ کے دن کمرہ عدالت میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا داخل ہوتا ہے، زندگی یا موت ان دونوں میں سے ایک کی سوغات اسے ملنے والی ہوتی ہے وہ فیصلہ سننے کے مرحلے سے گزرتے گزرتے نیم جان ہو جاتا ہے، کچھ ایسی ہی کیفیت اس لمحے میری تھی۔ اسی بنتی بگڑتی کیفیت میں، میں نے سرگودھا فون کیا۔ امی ڈرافٹوں کا کچھ بنا، نہیں بیٹے نذیر کا فون جدہ سے آنا تھا۔ ہم انتظار ہی کرتے رہے۔ مگر ابھی تک فون نہیں آیا۔ شاید آج آ جائے مگر امی، میں جملہ مکمل نہ کر سکی، امی شاید میری پریشانی بھانپ گئیں بڑے جمے ہوئے لہجے میں بولیں بیٹی کچھ کام اللہ کے سپرد کر دینے چاہیں کیونکہ ہمارا سب سے بڑا وسیلہ اسی کی ذات پاک ہے۔ تم گھبراتی کیوں ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر ان کے وہی لفظ وہی تسلیاں مگر میں مطمئن نہ ہو سکی میں تو خدشات کے پل صراط پر کھڑی تھی کیسے مطمئن ہوتی۔ امی، بھائی قاسم تو تیار ہیں نا، آخر میرے خدشات بول ہی پڑے۔ قاسم کے بارے میں کیوں وہم کرتی ہو بیٹی وہ انشاء اللہ ہم سے زیادہ وہاں جانے کا آرزو مند ہے۔ امی کہیں وہ ان کا وقتی فیصلہ تو نہ تھا۔ خدشے بولتے چلے گئے کیسی بچوں والی باتیں کر رہی ہو امی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ یہ فیصلے وقتی نہیں ہوتے جب کوئی انہیں زبان سے نکالتا ہے تو پھر یہ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ وہم مت کرو مطمئن رہو۔ انشاء اللہ جدہ سے ٹیلیفون آتے ہی اطلاع دے دوں گی دعا کرو۔ اور میں نے دھڑکتے دل کو ٹٹولتے ہوئے دعاؤں کے دامن تھام لیے۔ دو دن مزید گزر گئے وہ غالباً انیس جنوری کا دن تھا۔ شام کو امی کا فون آیا، مبارک ہو اور مبارک کے لفظوں نے ہر طرف روشنیاں پھیلا دیں۔ امی کیا سچ مچ کی مبارک باد ہے یہ دل، ابھی تک بے چینی کی کیفیت میں تھا، تو اور میں تمہیں بہلا رہی ہوں کیا؟ امی ہنستے ہوئے بولیں نذیر بائیس جنوری کو آ رہا ہے تئیس کو انشاء اللہ درخواستیں سپرد خدا کر دیں گے۔

واقعی امی، میرے پاس ابھی تک بے یقینی کے اندھیرے بکھرے تھے۔ کیا اب بھی میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ اچھا بائیس کو آجانا اور خود دیکھ کر یقین کر لینا وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ بائیس جنوری کی صبح بڑی روشن تھی۔ میں اپنا مختصر اسباب جو کہ ایک ہینڈ بیگ پر مشتمل تھا باندھے سرگودھا جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ بائیس کی شام کو بھائی نذیر جدہ سے فیصل آباد پہنچ رہے تھے میں ان سے پہلے سرگودھا پہنچ جانا چاہتی تھی، بچوں کو خدا حافظ کہا اپنا مختصر زاد راہ سمیٹا اور کوچ کے لیے تیار ہو گئی۔ اعجاز گاؤں گئے ہوئے تھے اور فلائنگ کوچ پر جانے کا قصد تھا میرا۔ فلائنگ کوچ پر بیٹھنے کا پہلے سے کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ اور یہ سفر تو شاید زندگی کا پہلا تنہا سفر تھا۔ سفر کیا تھا۔ اچھا خاصا خوف تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا بطور احتیاط چوڑیاں وغیرہ اتار کر گھر رکھ آئی تھی انگوٹھیاں جو کہ ہمیشہ انگلیوں میں پہنے رہتی تھی حفاظت کے خیال سے پرس میں رکھ لی تھیں کہ مبادا کوئی "تھرل" کے شوقین صاحب اپنا لشکتا ہوا پستول لے کر وارد نہ ہو جائیں اور میں اپنی عزیز انگوٹھیوں سے محروم نہ ہو جاؤں، مگر واہ ری بیوقوفی کی حد تک احمقانہ احتیاط کہ پرس میں انگوٹھیاں رکھ کر میں یوں مطمئن تھی جیسے انگوٹھیاں کسی آہنی سیف میں رکھ دی ہوں اور مسلح پہریدار ان کی حفاظت پر مامور ہو۔ یہ نہ سوچا کہ جو یہ مہربانی کرے گا وہ پرس کو بھی ازراہ مروت دیکھ ہی لے گا، خیر اپنی "عقل مندی" احتیاطیں اور لمبے چوڑے خوف خدانخواستہ حقیقت کا روپ نہ دھار سکے اور میں بخیریت سرگودھا پہنچ گئی۔ راستہ کن سوچوں میں کٹا شاید وہ بیان نہ ہو سکیں۔ مختلف قسم کے خیالات تھے جو دماغ میں گردش کر رہے تھے کبھی سوچا کرتی تھی ایسا بھی دن آئے کہ میں حجاز مقدس کی نیت کروں گی اور وقت میرا ساتھ دے میں حج کے فارموں پر دستخط کروں، یہ خیالات حقیقت کی دنیا کا منہ دیکھتے تو اپنے خول کے اندر سمٹ کر رہ جاتے وقت کی تلخیاں، حالات کے الجھاؤ کچھ اس طرح سے میری سوچوں کا منہ چڑاتے کہ میں سہم کر رہ جاتی۔ کہاں کا حج کدھر کا قصد۔ زندگی کے دھندے۔ عمر کے چکر۔ ایام کی گردش ایسے حالات میں بھلا وہ سب کچھ کیوں کر ممکن تھا بس چپ کر جاتی دل کو سمجھاتی کہ جب بارگاہ الٰہی سے بلاوا آئے گا تو کوئی مشکل منزلوں کے درمیان حائل نہ ہوگی مگر دل کو

سمجھانا اس وقت بیکار ثابت ہوتا جب کاروان روانہ ہوتے اپنے اپنے نصیبوں کی بلندی کا پروانہ سینے سے لگائے خوش نصیب کوچ کرتے۔ جاؤ اے پروانوں شمع نور خدا فروزاں ہے۔ جاؤ اور خاک بن کر وہیں بکھر جاؤ' ان کاروانوں کی روانگی کے منظر دیکھ کر حسرتوں کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں' آرزوؤں کے پھول کملانے لگتے۔ ایسے میں زندگی خود سے بھی منہ چھپانے لگتی۔ سرگودھا آگیا تھا۔ عظمیٰ کو میں نے کھڑکی سے مع بابا ڈرائیور کے دیکھ لیا تھا۔ تھکن سے بھرپور سانس لیتی ہوئی میں لوہے کے اس ڈبے سے باہر نکلی جسے فلائنگ کوچ کہا جاتا ہے۔ عظمیٰ کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھی۔ سامنے ہی بابا ڈرائیور جیپ میں بیٹھے تھے۔ گھر پہنچی تو گھر میں خاموشی تھی۔ امی و ابا جان بھائی نذیر کو لینے فیصل آباد جا چکے تھے۔ میں جو صبح خوشی میں ناشتہ کئے بغیر گھر سے نکلی تھی۔ اب خاصی بھوک محسوس کر رہی تھی۔ شاید یہ بھی خیریت سے گھر پہنچ جانے کا اثر تھا۔ شام کو امی و ابا جان بمعہ بھائی نذیر آ گئے۔ بھائی نذیر جن کے اس داستان کی تکمیل میں بہت اہم حصہ ہے' ہمارے ڈرافٹوں کے ساتھ سامنے موجود تھے۔ میرے ہاتھ میں ڈرافٹ کانپ رہا تھا۔ ہاتھوں کی تھرتھراہٹ میرے بس سے باہر تھی۔ زندگی کا ایک لازوال اور خوبصورت ترین لمحہ میری دسترس میں تھا۔ دیکھ رہی تھی' کانپ رہی تھی لفظ دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ہندسے مدہم مدہم سے لگ رہے تھے۔ شاید اس مبارک کاغذ کو چومنے کے لیے میری آنکھوں کا پانی بھی بیتاب ہو کر گرا اور ان میں جذب ہو گیا۔ اپنی حالت انوکھی تھی۔ نئی تھی۔ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ دنیا کتنی رنگین ہے۔ اس لمحے جانا' بڑی مشکلوں سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور دستخط کر دیئے۔ دستخط کرتے ہوئے بے اختیار آنکھوں میں کچھ بیتے ہوئے لمحے در آئے۔ ہر طرف گہما گہمی۔ لوگوں کا ہجوم۔ ملی جلی آوازوں کا شور ڈھولک کی تھاپ قہقہوں کا ترنم۔ ایسے میں گھر کے ایک کمرے میں ایک کم عمر لڑکی سر گھٹنوں میں چھپائے بڑی خاموش اور اداس بیٹھی تھی کہ یکایک شور اٹھا مولانا صاحب آ گئے۔ مولانا صاحب آ گئے' ہاتھ میں شادی کا رجسٹر تھامے' ایک مولانا مع دو معتبر اشخاص کے ساتھ اندر تشریف لائے' سر کچھ اور جھک گیا۔ بے چینی کچھ اور بڑھ گئی۔ کمرے کی بولتی چیختی رونقیں خموش ہو گئیں' وہ کم عمر لڑکی اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی ناکام

کوشش کر رہی تھی ایسے میں آنکھیں بھی اپنے بند توڑنے پر آمادہ نظر آتی تھیں۔ شام جدائی آنکھوں میں اتر آئی تھی مسافری کی مسافتیں شروع ہونے والی تھیں۔ زندگی جدائیوں کی سولی پر لٹکنے والی تھی جانے کیسے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے ٹیڑھے میڑھے لفظوں میں دستخط کر دیئے اور پھر مدتوں کی جمع کی ہوئی ہمت ٹوٹ گئی آنسو جیسے عمر قید کی سزا کے بعد رہا ہو گئے تھے۔ ایسے میں وہ ٹوٹے پھوٹے لفظ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ ان دستخطوں اور ان دستخطوں میں کتنا فرق تھا۔ مگر دونوں دستخط اپنی اپنی جگہ کتنے اہم تھے۔

***

پیرِوں ننگی سرِوں جھنڈولی سنیہا آیا پاروں

میری وہ تمنا جو کب سے دل کے اندر پل رہی تھی‘ بڑھ رہی تھی۔ جب عمل کی صورت کاغذوں کی مرہون منت ٹھہری تو مجھے ایسا لگا جیسے میں بالکل خالی ہو گئی ہوں‘ میرا وجود ادھورا ہو گیا ہو۔ اور اس کا اٹوٹ حصہ مجھ سے الگ ہو گیا ہو۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیا کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی متاع عزیز کو غیروں کے حوالے کر دیا اب وہ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ اسے کہاں رکھیں میں نے تو اسے برسوں دنیا کے سرد و گرم سے چھپا کر خانہ دل میں بڑی احتیاط بڑے ناز سے رکھا اب اسے دور کر کے پچھتاوے گھیر رہے تھے۔ دل امید نا امیدی کے درمیان پچھتاوؤں کا ہم سفر بن کر ڈول رہا تھا۔ جانے کیا ہو۔ جانے کیا ہو۔ میں نے تو منزل کو پانے کے شوق میں اپنی سب سے بڑی پونجی بھی راہ شوق پر لگا دی اور اگر منزل نہ مل سکی۔ تار تار دامن ہستی کو قبا نہ مل سکی تو کیا ہو گا یا اللہ میری لاج رکھیو میری آنکھوں سے بہتے ہوئے اشک ندامت کی لاج رکھیو۔ اگر میں نے اتنی بڑی گستاخی کر ہی ڈالی ہے تو اے پالنے والے میری جھولی کو بخشش کے پھولوں سے بھر دیجئے گا۔ میرے بار گناہ سے جھکے ہوئے سر کو اپنی رحمت کا سائبان بخشئے گا۔ میں تیری گناہ گار بندی پوری طرح سے جہاں کی آلودگیوں میں غرق ہو چکی ہوں اور جب گناہوں کے عذاب راتوں کے اندھیرے میں طرح طرح کے عفریتوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو خوف کے پسینے میں ڈوب ڈوب جاتی ہوں۔ ایسے میں دور کہیں روشنی کی کرن پھوٹتی نظر آتی ہے اجالا ان بھیانک اندھیروں پر چھانے لگتا ہے ہر طرف نور ہی نور رنگ ہی رنگ بکھر جاتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ کی حیات افروز صدائیں اس خوف کے احساس کو بدل ڈالتی ہیں وہی ہے راہ نجات وہی ہے سرچشمہ ابد وہی ہے اجالوں کی

منزل۔ پہنچ جاؤ' گھسیٹتے قدموں کے ساتھ' تھکے ہوئے ذہن و دل کے ساتھ' بھٹکتی ہوئی حیات کے خرابے کے ساتھ کہ وہیں دوام ہے۔ وہیں قرار ہے۔ سوئے حرم جانے کے خواب' حجاز مقدس کی سرزمین پر قدم رکھنے کی آرزو جانے کتنی پرانی ہے۔ شاید یہ پیاس جنموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ابتدا تو وہیں سے ہو گئی تھی۔ جب سرزمین مقدس پر پہلی بار لا الہ الا اللہ کا نور پھیلا تھا۔ یہ پیغام ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا' معطر معطر خوشبو کی طرح دلوں میں ایسا سمایا کہ چودہ سو سال گزر گئے مگر یہ نشہ توحید' یہ جذبہ لافانی یوں رگوں میں بسا کہ قبر کی مٹی میں گم ہو کر بھی تابندہ رہا' چمکتا رہا۔ انہی جذبوں کی ماری یہ جان کتنے جنموں سے سلگ رہی تھی—— جب درخواستیں ہو گئیں تو دن بہت ہی طویل ہو گئے۔ سورج صبح بہت ہی آہستہ آہستہ نکلتا اور ہولے ہولے رینگتا دن بڑی مشکل سے اختتام پذیر ہوتا۔ انتظار' انتظار اور انتظار ہر طرف' ہر سو انتظار کے مشکل مرحلے۔ کتنا شدید اور تکلیف دہ تھا یہ انتظار کہ جان جیسے انتظار کی سیخ پر چڑھی دنوں کی آنچ پر دہک رہی تھی۔ دن جو بہت لمبے بہت مشکل ہو گئے تھے۔ گنتے گنتے آخر جب تھک جاتی تو خود پر غصہ آنے لگتا۔ یہ کیسا روگ پال لیا ہے۔ یہ کیسے کرب سے دوستی کر لی ہے میں نے' کہ خود کو بھلا سا دیا ہے۔ ہر وقت ایک ہی لگن ایک ہی بے قراری۔ سب کام سارے مسئلے جیسے اس انتظار کے پہاڑ تلے دب کر رہ گئے تھے۔ امیدیں نا امیدیاں کرب بے قراریاں' ہر وقت تن میں ایک ہنگامہ سا مچا رہتا۔ عجب ظالم لمحے تھے اور عجب جستجو تھی۔ بہت دن بیت گئے اسی ہنگامہ روز و شب کے چکر میں۔ دن گزرتے رہے۔ انتظار بڑھتا گیا۔ دامن پھیلتا گیا۔ پانی بہتا رہا۔ زندگی اپنے سارے چلن چھوڑ کر شوق سے رشتہ استوار کر بیٹھی تھی اور شوق کی راہیں بہت کٹھن تھیں۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی لمحوں کے تانے بانے بن رہی تھی۔ خبرنامہ شروع ہو چکا تھا۔ ہیڈ لائنز میں ایک خبر ایسی آئی کہ جسم کا رواں رواں گوش بر آواز ہو گیا کان تو فریبی دھوکہ باز یونہی لفظوں کے ہیر پھیر میں الجھا دیتے ہیں ان کا یقین کیسا اس خبر کو تو جیسے جسم کا رواں رواں سن رہا تھا۔ آنکھیں ٹی وی سکرین پر لگ گئیں تھیں۔ ہر طرف آوازیں ہی آوازیں سماعتیں ہی سماعتیں۔ مبارک مبارک کے نعرہ ہائے دلنشیں' زندگی کس بلندی پر لے آئی تھی

کہ اپنا وجود جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ ماضی اور حال، مستقبل کی دلنشینیوں میں کھو گیا تھا۔ باقی کچھ نہ رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا اسی لمحے میں مدغم ہو گیا تھا۔ میں کیا تھی کیا بن گئی تھی خاک سے اٹھ کر آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچ گئی تھی۔ قبولیت کی نرالی و انوکھی گھڑی کچھ ایسی شان کے ساتھ آئی کہ ہر طرف روشنیوں، رنگوں، خوشبوؤں کے سیلاب مچل اٹھے۔ زندگی تیرا یہ جاوداں لمحہ۔ زندگی تیرا یہ زندہ لمحہ کتنے حیات افروز پیغام لے کر آیا کہ ہر سو زندگی پھیلا گیا۔ بہاروں کے موسم میں رنگینی بہار، دل کشی کے موسم میں حقیقی و ابدی دلکشی۔ موسم تو آتے رہتے ہیں آتے رہیں گے۔ مگر شاید بہار میں بہاروں کا حقیقی موسم پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اندر کا موسم تو شاید باہر کے موسم سے بھی نرالا تھا۔ تن کی نگری میں خوشیوں، مسکراہٹوں کے ایسے ایسے رنگ بکھرے تھے کہ باہر کے تمام رنگ ماند پڑ گئے تھے۔ اب کے بہار کتنے رنگ لے کر آئی تھی ہر طرف اجڑے ہوئے درخت پودے خزاؤں کا دردناک عذاب سہنے کے بعد بہاروں کا رنگین پیراہن پہنے مسکا رہے تھے میرا من بھی انتظار کی خزاؤں کا عذاب سہنے کے بعد امید وصل کی بہار کا دلکش پیراہن پہنے اترا رہا تھا۔ شوق کی راہوں میں ہر طرف پھول ہی پھول کھلے تھے خزائیں گزر چکی تھیں بہاریں آ گئی تھیں زندگی کی شاخ گل سے قطرہ قطرہ امید کی شراب طہور ٹپک رہی تھی میرے پیاسے من کی زمین سیرابی کی آس میں جی اٹھی تھی۔ ٹی وی اناؤنسر اعلان کر رہی تھی کہ سپانسرشپ کی درخواستیں قرعہ اندازی کے بغیر منظور کر لی گئی ہیں۔

* * *

اج تاں روز مبارک چڑھیا

۲۱ جولائی کا دن میری زندگی کا خوبصورت ترین اور یادگار دن۔ دن جس کی تڑپ میری رگ رگ میں زندہ تھی جو کہ بظاہر دوسرے دنوں جیسا ہی تھا۔ مگر میری زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ شاید وقت' دن' لمحے اپنی جگہ سب ایک سے ہوتے ہیں مگر ان کی اہمیت انسان اپنے طور اپنی کیفیات کے مطابق محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں ملنے والے ان گنت لمحے ایک دوسرے سے کس قدر جدا کس قدر مختلف ہوتے ہیں حیرت سے بعض اوقات سوچتی ہوں لمحوں کی پٹاری میں کیسے کیسے ناگ ہوتے ہیں۔ کیسے کیسے زہر بھرے ہوتے ہیں اور اگر اس منہ بند پٹاری سے بن بتائے بن کہے مہکتے دہکتے پھولوں کی مالا نکل کر گلے کی زینت بن جائے تو کیسا لگے۔ شاید میں اپنی اس انوکھی کیفیت کا اظہار نہ کر سکوں۔ شاید دنیا کے لفظ بہت کم ہیں اور جذبوں کی دنیا کی شدتیں بہت زیادہ جو لفظوں کی قید میں آ ہی نہیں سکتیں۔ بس مختصر یہ کہ میں اس زمانے میں اپنے جذبوں کی طغیانی کے آگے بند باندھنے میں ناکام تھی۔ میں آنکھیں بند کیے بہتی جا رہی تھی۔ ڈوب رہی تھی ابھر رہی تھی۔ اور اس عمل میں ہی شاید زندگی کا راز پوشیدہ تھا۔

۲۱ جولائی کا دن سفر کی ابتدا کا دن تھا۔ گو کہ سفر کی تیاریاں پچھلے چھ ماہ سے برابر ہو رہی تھیں اندر ہی اندر دل کے کسی سنسان گوشے میں لبیک کی صدائیں رونقیں بکھیرتی رہتی تھیں۔ ہر دم ہر گھڑی' مگر حقیقتوں کی تلخی روح میں بسی ہوئی تھی کہ دل کے حالات باہر لانے کی ہمت نہ تھی. مگر اس پالنے والے کے احسان مجھ بے بس پہ کہ میں سفر عظیم پر روانہ ہونے والی تھی۔ ہر طرف میرا سامان بڑی ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ میں حسب عادت اس بے ترتیبی پر جھنجھلاتی نہیں تھی بلکہ نازاں تھی جان بوجھ کر اس بے ترتیبی کو مزید پریشان کر دیتی۔ دیکھنے والے میری عادت کے برعکس میرے

آس پاس بکھری چیزوں کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کرتے تو میں مسکرا دیتی۔ ارے نادانوں تم کیا جانو یہ بکھری چیزیں تو مقدر کو سنوارنے کا سبب ہیں یہ بے ترتیبی تو زندگی کی علامت ہے۔ پچھلے کئی روز سے بھاگ دوڑ کا سلسلہ شروع تھا۔ پاؤں ہر وقت حرکت میں رہتے۔ بچوں کے رہنے کا مسئلہ۔ اعجاز کے اکیلے پن کا خوف۔ گھر کی دیگر ذمہ داریاں، دوست احباب سے ملنے ملانے کے چکر، سامان سفر کا حصول۔ ان سب متفرقات نے مل کر مجھے گھن چکر بنا ڈالا۔ اعجاز ہر دم میرے ساتھ ساتھ میرے شانہ بشانہ محبت سے شوق سے اور بعض اوقات اداسی سے۔ مجھے ان تمام ذمہ داریوں سے نکالنے میں پیش پیش، زندگی اپنے پیاروں کے ساتھ کتنی آسان ہو جاتی ہے۔ اس کا احساس ان دنوں ہوا میری تمام فکریں اعجاز کے کشادہ قلب نے سمیٹ لیں۔ بچوں کا کراچی کا پروگرام فائنل ہو گیا۔ ملنے ملانے کا چکر بھی تمام ہو گیا۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کرنے کی کوشش بھی تقریباً کامیاب ہو گئی۔ مطمئن ہو کر میں اپنے اٹیچی کو بند کر کے بیٹھ گئی۔ مگر نہیں اٹیچی تو پچھلے پندرہ روز سے مسلسل ایسے ہی بند ہو ہو کر کھل رہا تھا۔ کبھی کچھ، رہ جاتا تو کبھی کچھ مختلف قسم کی چیزوں سے بیچارا اٹیچی مسلسل موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں اسے بند کرنے کے لیے طاقت کا استعمال ضروری ہو گیا تھا۔ زور لگا کر بڑی مشکل سے بند کرتی تو پھر کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آ جاتی۔ جب بھی کسی سفر کی تیاری کی ہمیشہ بھولی بسری چیزوں کو اکٹھا کر کے لے جانے کی کوشش بے سود ثابت ہوئی جانے دماغ بھی کتنا شریر ہے۔ آنکھ مچولی ہی کھیلتا رہتا ہے۔ ہر وقت۔ مگر اس وقت تو اس کی شرارتیں بھلی لگتی تھیں۔ تو ذکر ہو رہا تھا سامان کی تیاری کا۔ بہت سی چیزیں جو اٹیچی کے ظرف سے زیادہ ہو گئیں انہیں اپنے اکلوتے زخمی ہینڈ بیگ میں ٹھونسنے کی کوشش شروع کی شاید میرا بکھرا پھیلا سامان اس بیچارے کے ظرف سے بھی زیادہ تھا اور میں اسے ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھی۔ گھر چھوڑنا آسان بھی اور مشکل بھی لگ رہا تھا۔ بچے کراچی تک ہمارے ہمسفر تھے ان کا اپنے ماموں کے پاس کراچی ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ لاہور ایئر پورٹ پر حاجیوں کی الوداعی رسمیں خاصی روائتی تھیں۔ پھول پتیاں، ہار، آنسو، دعائیں، سلام، محبتیں، عقیدتیں، اداسیاں، خاموشیاں۔ بہت سے لوگ، بہت سے جذبے، بہت سی بولیاں، بہت سی

آوازیں اور ان کے درمیان ہم قافلے والوں کی اہمیت گلے میں ہار ہی ہار تھے ــــ ان رنگ برنگے ہاروں نے ہر طرف ہی مہکار بکھیر دی تھی۔ سفر مبارک خوشبوؤں کے سنگ شروع ہو رہا تھا۔ معطر معطر ہواؤں کے دوش بدوش قافلہ حجاز چلنے کو تیار تھا دامن دل میں ہر طرف بھینی بھینی خوشبو مہک رہی تھی لمحے خوشیوں کی نوید لئے مہکتی خوشبو کی صورت میں ہماری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ہم چلنے کو تیار تھے امید وصل کے سورج طلوع ہو چکے تھے۔ چمکیلے دن کی ابتدا ہو چکی تھی گلے ملنے کی رسمیں ابھی جاری ہی تھیں کہ روانگی کا اعلان ہو گیا۔ ان بہت سی محبتوں سے دامن چھڑا کر ہم ان دیکھی محبتوں کی اور چل پڑے۔

***

ثابت صدق تے قدم اگیرے تاہیں رب لبھیوے ہو

ہم لوگ ۲۵ جولائی کو حاجی کیمپ سامان جمع کروانے اور کاغذات کی جانچ پڑتال کے لیے گئے۔ چونکہ ہم لوگ بھائی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے اس لیے حاجی کیمپ کی رہائش کا لطف نہ اٹھا سکے۔ حاجی کیمپ کی صاف ستھری اور نئی عمارت بھری بھری نظر آ رہی تھی۔ درختوں کے نیچے برآمدوں میں، کمروں میں، گھاس کے قطعات پر راہداریوں میں جیسے ہر طرف حاجیوں کا جنگل اگ آیا تھا۔ جگہ جگہ جا بجا بکھرا ہوا حجاج کا سامان، بے فکرے حاجیوں کی ٹولیوں کی چہار طرف مٹرگشت اور سامان جمع کرانے والے کاؤنٹر کے آگے قسم قسم کے ہینڈ بیگ اٹیچی کیس اور بستر بندوں کی قطاریں۔ چمکتے دمکتے ہینڈ بیگ اور ان کے ساتھ رسی سے باندھے ہوئے پلاسٹک کے لوٹے، جیسا کہ پہلے پاکستانی حجاج کے سامان کی زیادتی اور خستہ حالی کا ذکر سنا ہوا تھا۔ یہ سامان اس سے قطعی مختلف تھا۔ مختصر و ضروری صاف ستھرا نیا نکور سامان (شاید اب ہم پاکستانی کچھ بدل چکے تھے)۔ ہر طرف بھاگ دوڑ گہما گہمی کا عالم تھا۔ سامان جمع کرنے والا عملہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آ رہا تھا۔ کئی بزرگ حجاج طرح طرح کے سوالات سے اپنا بھی اور ان کا بھی کافی وقت ضائع کر رہے تھے۔ کبھی سامان اٹھاتے کبھی رکھتے۔ کبھی تکرار کرنے لگتے تو کبھی نرم پڑ جاتے۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ تمام مناظر دیکھ رہی تھی۔ ہمارا سامان جو کہ ایک ایک ہینڈ بیگ پر مشتمل تھا۔ انہوں نے ہمارے کہنے پر جمع نہ کیا۔ کیونکہ وہ ہلکے پھلکے ہی تھے اور ہمیں ان کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ گویا ہمارا کام ختم تھا۔ ٹکٹ جمع کروا کر ہم لوگ فارغ تھے۔ ٹکٹ روانگی سے تقریباً نو گھنٹے پہلے وصول کئے جاتے تھے۔ حاجی کیمپ یوں تو بڑا صاف ستھرا اور کشادہ ہے۔ مگر حجاج کرام کے رہن سہن کی بے ترتیبی اس کی تمام سہولتوں کو متاثر کرتی

ہے۔ ہر طرف بکھرے ہوئے حاجی صاحبان جگہ جگہ کھانے پینے کی اشیاء کے ڈھیر۔ جا بجا پھینکے ہوئے پھلوں کے چھلکے اور ان چھلکوں کو نوازتی ہوئی مکھیاں ان کے درمیان بے فکرے خوش گپیاں کرتے ہوئے حجاج کرام اگر تھوڑے نظم و ضبط اور ترتیب کا مظاہرہ کریں تو حاجی کیمپ ایک مثالی کیمپ بن سکتا ہے۔ گلے میں پی آئی اے کی جانب سے ملنے والا بٹوہ لٹکائے' صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک درمیانی عمر کی سیدھی سادھی بی بی کافی دیر سے ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ کبھی کاؤنٹر کے پاس چلی جاتیں کبھی برآمدے کے پاس کھڑی ہو کر کچھ کھوجنے کی کوشش کرتیں۔ کبھی سبزے پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بغور دیکھنا شروع کر دیتیں۔ ان کے مسلسل چکروں کو دیکھتے ہوئے میں انہیں مخاطب کر بیٹھی۔ کیا بات ہے خالہ جی۔ آپ کو تلاش ہے کسی کی؟ ارے تلاش سی تلاش ہے بیٹی۔ وہ پریشان لہجے میں بولیں۔ یہاں میرا ساتھی تھا۔ جس کے پاس میرا سامان اور کاغذات تھے اب نہ تو وہ ساتھی ہی نظر آ رہا ہے اور نہ ہی سامان کی کچھ خبر ہے۔ وہ بہت ہی پریشان لگ رہی تھیں۔ سامان کی تو کچھ پرواہ نہیں بیٹی مگر کاغذات نہ کہیں کھو جائیں بس یہی دھڑکا ہے۔ مگر آپ کا ساتھی آپ کا رشتہ دار وغیرہ ہے کیا' نہیں بیٹی رشتہ دار ہوتا تو فکر کاہے کا تھا۔ ہمسایہ ہے میرا اور میں اس کو اپنا محرم بنا کر ساتھ لائی ہوں' اوہ تو یہ بات ہے مجھے اچانک اعجاز کی شرط یاد آگئی جو انہوں نے محرم کے سلسلے میں عائد کی تھی۔ کتنی دور رس سوچ تھی ان کی۔ کتنا سچ کہا تھا انہوں نے اور اس سچ کی حقیقت کا اندازہ میں نے پاکستان میں ہی ان بیچاری فکر مند حاجن کو دیکھ کر لگا لیا کہ واقعی سچا محرم اور اچھا ساتھ اس سفر عظیم میں بہت ضروری ہے اب وہ بیچاری مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے گھر سے ایک ہمسائے کے ساتھ اس کے اعتماد پر بھروسہ کر کے نکل آئیں۔ مگر ابھی شروعات میں ہی کتنی پریشانی اٹھا رہی ہیں آگے پتہ نہیں پردیس میں کیا حال ہو۔ آپ مطمئن رہیے وہ سامان وغیرہ کے سلسلے میں ہی کہیں گئے ہوں گے آ جائیں گے۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ حوصلہ کہاں بیٹی سب گھر والے منع کرتے تھے۔ اپنوں کے بغیر مت جاؤ۔ مگر میں سب کو یہی کہتی رہی کہ ہمسایہ بھی تو اپنا ہی ہوتا ہے اور پھر اس مبارک سفر میں تو تمام ہمسفر ہی اپنے ہیں۔ آنے کی لگن میں میں نے کسی کی نہ مانی اور اب گھر

سے نکلتے ہی پریشانی ہو گئی۔ نجانے آگے کیا ہو شوق کے ہر مسافر کی تڑپ ایک سی تھی۔ ایک ہی منزل ایک ہی ڈوری سے بندھے ہوئے لوگ‘ کمزور وسائل کو جذبوں کی مضبوطی سے کامیاب بنائے مرکز کی جانب رواں دواں لوگ۔ میں بڑی عقیدت سے اس نامکمل وسائل مگر مضبوط ارادے والی خاتون کو دیکھ رہی تھی جو تن تنہا ایک کمزور رابطے کے سہارے منزلوں کی طرف کوچ کرنے والی تھیں اچھا بیٹی میں اب پھر اسے تلاش کرتی ہوں۔ شاید مل جائے۔ وہ جانے کے لیے مڑیں دعا کرنا بیٹی کہ خدا سفر کی مشکل سے سب کو محفوظ رکھے۔ آمین بے اختیار لبوں سے یہ دعا نکلی۔

***

چلو دیکھئے اوس مستانڑے نوں
جدھی ترنجناں دے وچ پئی اے دھم

اللہ کے فضل و کرم سے حج کا مبارک سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں جہاز کی سیٹ پر بیٹھی دھڑکتے دل کے ساتھ اس مبارک سفر کی ابتدا کر رہی تھی جس کے خواب میری تشنہ آنکھوں نے صدیوں پہلے دیکھے تھے۔ جن کی تعبیر کے لیے عمر کا لمحہ لمحہ ترسی تھی میرا قافلہ حجاز کی مقدس سر زمین کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ زندگی کے وہ لمحے شاید زندگی کا حاصل تھے۔ حیات کل تھے۔ بچے پچھلے دو دن سے مسلسل چھپے چھپے آنسوؤں سے میرے بڑھتے قدموں کا تعاقب کر رہے تھے میرے ارادوں کے قطب نما اپنی منزلوں کی نشاندہی کر چکے تھے بھلا ان ننھی ننھی رکاوٹوں سے کیا متاثر ہوتے۔ ان کے معصوم آنسو تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے چمٹنا۔ پاس سونے کی ضد کرنا۔ ایک پل بھی مجھ سے دور نہ ہونا۔ یہ سب چیزیں ان کی دلی کیفیت کی غماز تھیں۔ مگر شاید ان دنوں اپنے دل کی کیفیت بھی کچھ انجانی سی تھی اور یہی کیفیت مجھے ان معصوم محبتوں سے جدائی کی ہمت بخش گئی۔ ان کو سپرد خدا کر کے میں محبتوں کی اور چل پڑی جو مجھے بلا رہی تھیں لبیک اللھم لبیک۔ سفر شروع ہو چکا تھا۔ جہاز کی فضا حاضری کے بولوں سے گونج رہی تھی۔ آسمانوں کے فرشتے حاضری کا رجسٹر کھولے ہماری حاضریاں لگا رہے تھے اور شاید ہماری پوری جماعت حاضر تھی۔ حاضری کا جوش تمام چہروں پر پایا جاتا تھا ۔ ساری جماعت مختلف چہروں۔ مختلف زبانوں والے بچوں سے بھری ہوئی تھی۔ پشتو، سندھی، بلوچی، پنجابی مختلف رنگ مختلف آوازیں مگر سب حاضر سب موجود۔ حاضری کی ڈوری سے بندھے مرکز کی جانب رواں دواں، گزری تمام شب رت جگے کی نذر ہو گئی۔ کیسی تڑپ تھی جو ایک پل بھی ٹکنے نہ دیتی تھی۔ شوق سفر،

جستجوئے منزل، بے چینی دل یہ سب چیزیں مل کر رت جگے کا سامان بن گئیں صبح سحری کے وقت ہی تمام ساتھی جاگ اٹھے۔ سفر کا اہتمام ہونے لگا ۔ کوئے حرم کی تیاریاں زور پکڑنے لگیں۔ ساتھی اکٹھے ہوتے گئے کاروان بنتا گیا۔ سفر شروع ہو چکا تھا" فبای الاء ربکما تکذبن" اس کی مہربانیوں کی گھٹا ٹوٹ کر برس رہی تھیں اس کی نعمتوں کی پھوہار جسم کو بھگو رہی تھی جسم جو فرش سے اٹھ کر عرش پر پہنچ چکا تھا۔ تقدیر خود پر نازاں تھی آنکھیں تشکر کے پانیوں میں غرق ہو چکی تھی۔ کیونکہ اپنے تہی دامن میں تو بس پانی ہی پانی تھا۔ ندامتوں کا، محبتوں کا، عقیدتوں کا اور تشکر کا، پانی کی ندی اس روز خوب چڑھی ہوئی تھی۔ جو اپنے ساتھ تمام گزرے بے وفا لمحے بہائے لیے جا رہی تھی۔ جسم جیسے ہلکا پھلکا ہو کر فضاؤں میں آزاد پنچھی کی طرح پرواز کر رہا تھا۔ میں جہاز میں کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی. زمین نیچے بہت نیچے رہ گئی تھی۔ اس کی نفرتیں، اس کی عداوتیں، اس کی محبتیں، اس کی رسمیں، اس کے عذاب، اس کے گناہ، اس کے ثواب بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ہم ان سب زنجیروں سے آزاد کتنے اونچے کتنے مطمئن و مسرور بیٹھے تھے۔ جہاز کی فضا میں خاموشی سی طاری تھی۔ اس خاموش فضا کو توڑتی ہوئی لبیک کی صدا ایک انجانا مگر دل کو چھوتا ہوا تاثر دیتی تھی اس خاموش، نرم نرم فضا میں گاہے گاہے کسی حاجی صاحب کی آواز گونجتی جو کہ اپنی ضرورتوں سے فضائی میزبانوں کی خاصی پریڈ کروا رہے تھے۔ ہمارا جہاز پاکستان سے پاکستانی وقت کے مطابق آٹھ بجے روانہ ہوا. چار گھنٹوں کے سفر کی آخری ساعتیں آن پہنچی تھی۔ صدیوں کی دوریوں کو جہاز نے کس قدر جلد ختم کر دیا تھا۔ وصال کے لمحے اختتام پذیر تھے۔ وصل کی گھڑیاں آن پہنچی تھیں۔ جہاز ہولے ہولے جدہ ایئرپورٹ پر رینگ رہا تھا۔ میں کھلی آنکھوں سے اس سرزمین کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی تڑپ میری ہستی کا ناسور بنتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں آیا ہوا تشکر کا پانی مجھے منزلوں کے قرب کی نوید سنا رہا تھا لبیک کی صدائیں، دامن دل کو سرور بخش رہی تھیں۔ سب لوگ اپنے اپنے احرام ٹھیک کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ مبارک ہو حاجی صاحبان! جہاز کے کپتان کی آواز گونجی۔ میں آپ کو انتہائی مسرت سے یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ ہم حجاز مقدس پہنچ چکے ہیں اور تھوڑی دیر بعد انشاء اللہ جدہ ایئرپورٹ پر اتریں گے۔ آپ سے گزارش

ہے کہ ملک و ملت اور ہمارے لیے دعائے خاص کریں۔ ہماری تمام تر دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کا یہ سفر عظیم مبارک و کامیاب بنائے آمین۔ جہاز کے کپتان کی پر خلوص دعائیں سن کر مجھے ادراک ہوا کہ ہم پاکستانی کتنے نرم دل کتنے مہربان ہوتے ہیں چاہے جہاز کے کپتان ہوں یا حجاز مقدس کا قصد کرنے والے گناہگار بندے۔ ہماری پہچان تو ہر جگہ ایک ہی ہے پہلے مسلمان اور پھر پاکستانی۔ اپنے ملک و ملت کے لیے پر خلوص دعائیں۔ ہم جہاں بھی ہوں جس حال میں بھی ہوں بہرحال مانگتے ہیں۔ جہاز ہولے ہولے رینگتا جدہ ایئر پورٹ کے حج ٹرمینل پر جا رکا۔ جدہ کا جدید ترین و خوبصورت ایئر پورٹ ہمارے سامنے تھا۔ ہمارا استقبال سعودیہ ایئر فورس میں ملازم پاکستانیوں اور سعودیوں نے بڑی گرمجوشی سے کیا۔ ہم ایک بہت بڑے ایئر کنڈیشنڈ ہال میں بیٹھ گئے اب یہاں ایک پل بھی بیٹھنا محال لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا جلد از جلد قربتوں کو پالیں ان منزلوں کو پالیں جن کی آرزو ایک عرصہ سے دل کو جلا رہی تھی۔ مگر دل کی باتیں' دل کے معاملے' قانونی تقاضوں کے آگے کہاں چل سکتے ہیں۔ وہاں تو بہت سی ضروری کاروائیاں۔ کاغذات و پاسپورٹ کی چیکنگ نئے کارڈوں کا اجراء سامان کی وصولی اور کسٹم چیکنگ وغیرہ وغیرہ تھی۔ ہم تمام قافلے والے اپنی پاکستانی عادت کے برعکس بڑی ترتیب و نظم و ضبط سے لائنوں میں لگ گئے وہ سب ترتیب شاید سعودی عرب کے قوانین کا اعجاز تھی۔ بہرحال ہم سب بڑی خاموشی سے ترتیب وار اپنے کاغذات کی پڑتال کرواتے رہے۔ لائن گھٹتی رہی کاروائی چلتی رہی۔ یہاں تک کہ ہم ہولے ہولے پاسپورٹ چیکنگ سے نمٹتے کسٹم عملہ تک جا پہنچے۔ کسٹم آفیسر ایک عرب تھا۔ تھوڑی تھوڑی انگریزی بھی جانتا تھا۔ ہمارا کارواں چھ نفوس پر مشتمل تھا۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے سارے سامان کی چیکنگ کرانا میرے ذمہ تھی۔ سب سے پہلے میرے ہینڈ بیگ کی باری آئی میں نے ساری چیزیں نکال کر ڈھیر کر دیں۔ آفیسر نے ادھر ادھر سے بیگ ٹٹولا اور میرا بیگ کلیئر کر دیا۔ یو پاکستانی اس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔ یس میں نے جواب دیا اور دوسرا سامان چیکنگ کے لیے آگے کر دیا۔ اس نے حسب دستور خوب چھان پھٹک کی مگر ہمارے پاس کیا تھا جو قابل گرفت ہوتا لے دے کر چند جوڑے کپڑے اور دو عدد جوتے تھے۔ اس نے اس کے

بعد سامان کو رسمی چیکنگ کے بعد کلیئر کر دیا آخر میں شولڈر بیگ کی باری تھی۔ اس میں ضروری دوائیاں حج کی کتابیں اور کاغذات وغیرہ تھے۔ کتابوں کو دیکھتے ہی اس نے پکڑ کر ایک طرف رکھ لیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ انہیں آپ نے الگ کیوں رکھ دیا ہے کیا وجہ ہے تو وہ بولا۔ اس لیے کہ ان میں بہت کچھ ہوتا ہے مثلاً کیا' میں نے پوچھا۔ ہیروئن چرس وغیرہ وغیرہ اس نے وضاحت کی اور میں چپ ہو گئی۔ معاً ایک حاجی کا قرآن شریف کی جلد میں نشہ آور اشیاء لے جانے والا واقعہ مجھے یاد آگیا۔ ہم لوگوں نے اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو کس قدر بدنام کر ڈالا ہے کہ ہمارے دوست ملک بھی ہمیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگ پڑے ہیں۔ افسوس کہ ہم نے فریضہ حج کو بھی جرائم میں شامل کر لیا ہے۔ میں نے دکھ سے سوچا پھر میں نے سارے شولڈر بیگ چیکنگ کے لیے کھول دیئے اس نے تمام شولڈر بیگ چیک کئے بغیر کلیئر کر دیئے۔ اس کا یہ بے لوث اعتماد دیکھ کر میں شرمندہ ہو گئی۔ کتابیں اس نے مجھے لا کر دے دیں۔ گڈ لک حج۔ اس اجنبی کسٹم والے کا سلوک بہت متاثر کن تھا۔ شاید ہم پاکستانی اب بھی قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ دل نے ہولے سے سرگوشی کی۔ میں نے کتابیں اٹھائیں۔ سامان سنبھالا اور ساتھیوں کے ہمراہ باہر چل دی۔ کمرے سے باہر نکلے تو دن کی تیز روشنی نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں چندھیا دیں آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھنے کی کوشش کی تو سامنے بھائی نذیر کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر ہم ان کی طرف بڑھے۔ ہمارا سامان ان کی کاروں میں منتقل ہو گیا۔ ہم دھیرے دھیرے کاروں کی سمت بڑھنے لگے۔ جدہ ایئر پورٹ کا حج ٹرمینل بہت وسیع اور جدید سہولتوں سے مزین ہے۔ اونچے اونچے بغیر ستونوں کے سفید سفید شیڈ ہر طرف کپاس کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ ان کے اندر برقی پنکھے اپنی کارکردگی دکھا رہے تھے۔ جن کے نیچے بچھی ہوئی کرسیوں پر حاجی صاحبان بیٹھے ٹھنڈے مشروبات سے دل بہلا رہے تھے۔ ایئر پورٹ پر جا بجا ٹھنڈے مشروبات کے سٹال سجے ہوئے تھے۔ حاجیوں کی گہما گہمی اور بھاگ دوڑ سے ہر طرف میلے کا سا سماں تھا۔ کچھ حاجی صاحبان ٹیکسیوں پر سوار ہو رہے تھے اور زیادہ تر معلم کی بسوں کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ جو محبوب کے وعدے کی طرح بے وفا ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ راستوں پر آنکھیں لگائے صبر و شکر سے انتظار کر رہے

تھے کہ "کبھی تو آئے گا رحم ان کو کبھی تو وعدہ وفا کریں گے۔" چند لمحے اس ہنگامہ پرور اور جذبوں سے بھرپور ماحول میں گزار کر ہم لوگ کاروں میں سوار ہوئے منزل شاید اب ہم سے تھوڑے ہی قدم دور تھی۔ گھر سے نکل کر پڑاؤ کے مرحلوں سے گزرنے کا عمل ابھی جاری تھا۔ پہلا پڑاؤ کراچی کا تھا دوسرا پڑاؤ جدہ کا جو کہ چند گھنٹے ہی تھا۔ مگر منزل ابھی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ نظروں کی رسائی سے دور تھی۔ نزدیک تو تب سمجھتے جب نظروں کی دسترس میں ہوتی۔ آنکھوں میں جھلملاتی، چاہے فاصلوں کے حساب سے بہت نزدیک تھے۔ مگر دیدار کی حدوں سے بہت دور تھے۔ ہماری کار طریق مکہ کے فراخ سینے پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ فاصلوں کے دامن سمٹتے جا رہے تھے، وصل کے لمحے فراق کے سینے پر مونگ دلتے کلکاریاں مارتے چلے آ رہے تھے۔ زندگی اپنا ایک انوکھا اور روپہلا لمحہ میرے دامن میں ڈالنے چلی آ رہی تھی۔ بھائی نذیر کار ڈرائیور کر رہے تھے۔ میں پیچھے رہ جانے والے فاصلوں اور نزدیک آنے والی منزلوں کے سفر کو تیزی سے سمٹتا دیکھ رہی تھی۔ زبان جو کبھی باتیں کرتی نہ تھکتی تھی۔ چپ چاپ خاموشی سے دبکی پڑی تھی۔ وہ احساسات کا سفر تھا۔ جو آنکھوں کا کام تھا۔ آنکھیں پل پل رکے بغیر ارض حجاز کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر سمو رہی تھیں۔ میرا چھوٹا سا قافلہ، فاصلوں کی تھکان اور گرمی کے باوجود تازہ دم تھا۔ دور سے آبادی کے آثار نظر آئے وہ سامنے مکہ ہے، بھائی نذیر بولے مکہ جو دین کامل کی پیدائش کا شہر ہے وہ مکہ جس کے گلی کوچوں میں سرور کونینؐ کے بچپن سے لے کر جوانی کا دور اور دین کی اشاعت کی مشکلوں کا دور بیتا۔ مکہ جس کی تاریخ ہمارا ایمان، ہماری روح ہے، مکہ جس کا نام ہمارے دل کی کتاب پر ازل سے لکھا گیا ہے۔ وہ روشن جھلملاتا جگمگاتا نام وہ شہر اول، شہر آخر، کعبۃ اللہ کی قسم، مکہ خدا کی اس سرزمین پر خدا کا انعام ہے۔ میں لرزتے جسم کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ مکہ کو قریب آتا دیکھ رہی تھی، مکہ کو پہلی نظر دیکھ کر مانگی جانے والی دعائیں اللہ کے ہاں بڑی مقبول ہوتی ہیں بھائی نذیر کی آواز گونجی۔ ہاتھ اٹھے دست دعا دراز ہوئے دعائیں اپنے وجود کے ساتھ پوری شدت سے باہر نکلنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ مگر لبوں کے تالے بند تھے۔ زبان جیسے عمر بھر کی تھکان اتار رہی تھی۔ میری بولتی زبان چپ تھی۔ دعائیں جسم کی کال کوٹھری میں سر پٹختی رہ

گئیں۔ مچلتی رہ گئیں۔ ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ مگر کوئی لفظ کوئی فقرہ ادا نہ ہو سکا مجھ سے۔ اس وقت جان جیسے تمام سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔ ذہن و دل کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں بس گئی تھیں۔ آنکھیں بے کل ترستی آنکھیں، پاگل پیاسی آنکھیں میری ذات کا کل بن گئی تھیں۔ سارے ہجر و فراق کے قصے سمٹ آئے تھے آنکھوں میں۔ ساری جدائیوں کے فسانوں کی گواہ تھیں آنکھیں، قصہ درد و الم کی شاہد تھیں آنکھیں، مشکلوں نا امیدیوں کے خوں بار لمحوں کی امین تھیں آنکھیں، اے آنکھوں میری گواہی دینا، میری گواہ رہنا دیکھنے والو دیکھو کیا بن گئی آنکھیں۔ آپ اپنے ہی دامن سے لپٹ کر رو پڑی، آنکھیں مکہ نزدیک آ گیا۔ ہم مکہ میں مکہ ہم میں مدغم ہو گیا۔ لو ہم زنجیروں کو توڑ کر نکل آئے آ گئے قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلتے۔ رستوں کی پیہم دشواریوں کو پھلانگتے، جدائیوں کی سزائیں بخشنے والوں سے بچتے بچاتے۔ فراق کی گھڑیوں کو گنتے ہم آ گئے۔ دھندلائی ہوئی نگاہیں یکبارگی جو اٹھیں تو جھکنا بھول گئیں۔ سامنے نگاہوں کی رسائی میں مسجد الحرام کے مینار پوری شان و آن اور جاہ جلال کے ساتھ سر اٹھائے کھڑے تھے، اللہ اللہ کیا نظارہ تھا۔ سورج آہستہ آہستہ انہیں اسلامی دیتا سرنگوں ہوتا جا رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی ہلکی ہلکی سرخی نے ہر طرف گلال بکھیر دیئے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مست خرامی سے گزر رہے تھے۔ میرے تن بدن میں کپکپی سی طاری ہو گئی یوں جیسے جاڑے کا بخار چڑھ گیا ہو۔ میں لرز رہی تھی۔ ڈول رہی تھی۔ بشریٰ دیکھو۔ اب ہم مسجد الحرام کے باب عبدالعزیز کے سامنے ہیں۔ میری بند آنکھیں کھلیں۔ نہیں نہیں میں نہیں دیکھوں گی۔ یوں قطرہ قطرہ کر کے میں دیدار کی پیاس کو ترسانا نہیں چاہتی۔ یہ آنکھیں مرکز پر جا کر ہی کھلیں گی۔ مجھے لے چلو کیا جنون تھا کہ میں بے حال سی ہوئی جا رہی تھی۔ لرزتے کانپتے قدموں سے اتری ایک لمبا گہرا سانس لیا۔ مکہ کی عطر بیز ہواؤں کو روح و دل میں اتارنے کی کوشش کی اپنے نا آشنا وجود کو اس مہکار سے معطر کرنے کو من چاہا۔ میرے قدم گناہگار قدم۔ لغزشوں کی ڈگمگاہٹ لیے ہوئے ڈولتے قدم۔ جھکی جھکی نگاہیں دبی دبی سانسیں، پسینہ پسینہ وجود۔ الحرم کی چار دیواری اس کی شان و شوکت، عظمت و بلندی اور اپنا بے حقیقت بے کار وجود۔ باب فتح سے داخل ہونا تھا۔ سارے حاجی حاضری

کی رسم نبھانے کے لئے، اندر جا رہے تھے، میرے کانپتے لرزتے شرمندہ قدم ڈول رہے تھے۔ دل پنجرے کے اندر بے بس چکور کی طرح سر پٹخ رہا تھا۔ اپنے چاند کے دیدار کو ترس رہا تھا۔ مگر گناہوں کے بوجھ سے بھاری قدم آگے بڑھنے کی ہمت نہ پا رہے تھے۔ آرزوؤں کی تپش نے آنکھوں میں انگارے بھر دیئے تھے شرمندہ آنکھیں کیسے اٹھیں گی۔ کیسے اس عظمت و جلال کے منبع کو دیکھ پائیں گی یا اللہ کیسی آزمائش کی گھڑی آ پہنچی۔ کیسی کٹھن منزل آگئی کہ منزل پر پہنچ کر پاؤں لہولہان تھے پرواز کے سارے پر کٹ گئے تھے۔ میں یوں کھڑی تھی جیسے کوئی مجرم عدالت کے کٹہرے میں سزا کے دن کھڑا ہوتا ہے۔ ابھی اسی کشمکش کی سولی پر لٹکی کھڑی تھی کہ مشکل آسان ہو گئی۔ تازہ حاجیوں کے ایک ریلے نے مجھے گھسیٹ کر اندر پٹخ دیا۔ دھکوں کی یلغار نے فٹ بال کی طرح اٹھا کے دروازے کے اندر پھینک دیا۔ خود کو سنبھالتی اٹھی تو سامنے اللہ کا گھر اپنی ساری عظمتوں اور جاہ و جلال سمیت کھڑا تھا۔ اللہ اللہ کیا نظارہ۔ کیا جلوے تھے۔ کیا گھڑی تھی کیسا منظر تھا۔ نظریں اٹھیں تو اٹھیں رہ گئیں۔ دست دعا جو خود بخود ہی پھیل گئے تھے۔ ٹوٹی طنابوں کی طرح نیچے گر گئے میں نے لڑکھڑا کر سہارا لینا چاہا تو ہاتھ کسی حاجی کے شانے پر پڑا میں گھسیٹتی ہوئی مرکز تک جا پہنچی۔ ساری حسرتیں، بے قراریاں دل کھول کر رو رہی تھی مشکلوں کے قصے، نا امیدیوں کی داستانیں، زمانے کی تلخیاں، تقدیر کی سختیاں سب قطرہ قطرہ کر کے بہہ رہی تھیں گزری عمر کے تمام درد قطروں کی شکل میں نکل رہے تھے۔ من کا بے کل پنچھی پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس وقت کی طنابیں شاید میرے اپنے ہاتھ میں تھیں میں اس وقت کی بادشاہ تھی۔ اپنے مالک کے تحفظ اور پناہ میں آکر کتنی محفوظ و مامون ہو گئی تھی۔ کتنی بہادر بن گئی تھی کہ اپنی تمام معصیتیں بتاتے وقت ذرا نہ جھجکی اس سے کیا چھپانا اس سے کیا پردہ جو ہمارے اندر باہر ہر سو پھیلا ہوا ہے۔ زبان کی خموشی اپنی جگہ قائم تھی ـــــ مگر سسکیاں اور آہیں، جدائی کی کٹھنائیاں اپنی زبان بے زبانی میں عرض حال کہہ رہی تھی کیسی پناہ۔ کسی امان تھی اس لمس میں کتنی شدت ان ملن کے لمحوں میں تھی۔ جسم کو دیوار کعبہ کے ساتھ لگائے بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ آہ کتنی دوریاں ہیں کتنے بے سرو سامانی کے ستم سہے غم جاناں غم دوراں کی ساری چبھن آنکھوں سے میرے وجود میں در آئی تھی۔ دل

چاہ رہا تھا۔ وجود فنا ہو جائے، یہیں ان ہواؤں میں مدغم ہو جائے جو کعبۃ اللہ کے اردگرد طواف کرتی رہتی ہیں۔ ہر وقت، میں کیا تھی، میں کیا ہوں، کچھ یاد نہ تھا۔ دیوار کعبہ سے لگی کھڑی تھی۔ یہ حقیقت تھی۔ کاش یہ حقیقت تمام عمر پر پھیل جائے۔ کاش یہ لمحے جاوداں ہو جائیں۔ یہ گھڑیاں قیامت تک پھیل جائیں کاش زندگی کا سفر یہیں اسی لمحے تمام ہو جائے کاش مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ہوا تو یہ کہ ایک جھٹکا سا لگا، میرے سر میں، کسی نے یوں تھپڑ مارا کہ سر گھوم گیا۔ مگر اس وقت کسے ہوش تھا اپنے مہربانوں کی مہربانیوں کو دیکھنے کا۔ بدستور وہی عالم طاری تھا کہ ایک اجنبی لب و لہجے نے مجھے عالم حیرت سے واپس عالم فانی میں لا کھڑا کیا۔ "حرام حج حرام" نہایت سختی اور بے دردی سے کسی نے مجھے جھنجوڑ کر غلاف کعبہ سے الگ کیا۔ میں نے جلتی آنکھوں سے مداخلت کرنے والے کی طرف دیکھا۔ پردہ کرو پردہ، کہنے والے نے اور بھی سختی سے کہا میں نے بے اختیار اپنی طرف دیکھا۔ پردہ کیسا پردہ، پردہ تو تھا، کپڑے تو میرے باپردہ ہیں پھر میں اسے بے پردہ کیوں نظر آ رہی ہوں۔ میں نے حیرت سے سوچا جاؤ جاؤ اس آواز نے اب مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ میں سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر ذہن میں ایک ہی لفظ کی گردان جاری تھی۔ پردہ پردہ، پھر اک بجلی سی کوندی اور آگہی کے سارے دروا کر گئی، واہ پالنے والے، بڑے گھر والے، تیرے صدقے تجھ سے تو ہماری کوئی بات نہیں چھپی ہوئی مگر تیرے گھر کے یہ ادنیٰ غلام بھی صاحب نظر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنی گزری زندگی کے کئی بے پردہ پل آنکھوں میں گھوم گئے۔ گلے میں لہراتے ڈوپٹہ کا تکلف اور شہر کی گلیاں، بے حجاب نظروں کا تعاقب اور کھلا سراپا۔ کیسا پردہ کہاں کا پردہ۔ پردہ تو آنکھوں کا ہوتا ہے۔ دل کا ہوتا ہے۔ یہ چادریں، نقاب، برقع، دوپٹے تو صرف لوگوں کو دھوکا دینے کا سامان ہیں۔ وہ سب تاویلیں وہ سب بہانے جو اپنے اندر کی باپردہ و باحجاب روح کو سمجھانے کے لیے میں گھڑا کرتی تھی، ان کی حقیقت اور سچائی بے نقاب ہو چکی تھی۔ اس مقدس مقام پر مجھے پہلی ہی حاضری میں بتا دیا گیا تھا کہ میں سوچوں کے اندھیرے میں غرق تھی۔ دنیا کی چمکیلی روشنیوں میں روح کو اندھیرے سونپ بیٹھی تھی۔ میں جو اپنی سوچوں اور نظریات میں خود کو سچا سمجھتی تھی۔ ہم جو گناہ بھی کرتے ہیں اپنے دل کی تسلی کے لیے اس کی کوئی نہ کوئی تاویل گھڑ

لیتے ہیں کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لیتے ہیں کہ ہم لوگ گناہ بھی پورے اطمینان قلب سے کرنا چاہتے ہیں مبادا کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے اور وہ معصوم دبا حجاب روح بعد میں کچوکے نہ لگاتی رہے جو ہمیں ہماری غلط کاریوں پر ٹوکنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ ہم اس روح کو بہانوں کی تھپکی دے کر پہلے میٹھی نیند سلاتے ہیں اور پھر گناہوں کی منہ بند پٹاری کا ڈھکنا کھولتے ہیں ہم لوگ دنیا کی چمک دمک گزیدہ لوگ ان جاہلانہ تاویلوں اور من گھڑت بہانوں سے وقتی طور پر دل کی تسلی کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ مگر حقیقتاً اپنی با حجاب روح کو نہ مٹنے والے روگ دے دیتے ہیں جو اسے اندر ہی اندر گھائل کرتا رہتا ہے۔ اس وقت اللہ کے بڑے گھر کے خادم کے مختصر لفظوں نے کچھ ایسی توڑ پھوڑ میرے اندر مچائی کہ میں بکھرنے لگی۔ آگہی کے اس لمحے کو پانے کے بعد میرے اندر ندامت کی آگ بھڑک اٹھی میرے رکے رکے قدم دیوانگی سے اللہ کے بڑے گھر کے گرد چکر لگانے لگے۔ ایسے میں نظریں جھکی جھکی اور قدم شرمندہ تھے وصل کے لمحات جن کو پانے کی جوت دل کے اندر جل رہی تھی ہنوز دور تھے۔ اپنے روٹھے محبوب کو منانے کی دھن میں تن من کی سدھ کھو بیٹھی تھی دیوانہ وار چکر لگا رہی تھی اور اسے پکار رہی تھی ایسے میں پردے کا اہتمام نجانے کیسے سلامت رہ گیا شاید روح کے روگ حقیقتوں کے روپ میں سامنے نکل آئے تھے اور خدا کے بڑے گھر کے خادموں کے روپ میں مجھے باآواز بلند ڈانٹ رہے تھے۔ پردہ کرو‘ پردہ‘ اور میں سہمے ہوئے وجود کو گھسیٹے چادر کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹے چکر لگا رہی تھی لبیک اللھم لبیک حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں جسم و جان کی تمام کمزوریوں کے ساتھ زیست کی مصیبتوں اور لغزشوں کے ساتھ اپنے بے حجاب و بے پردہ گناہ گار وجود کے ساتھ‘ حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں۔

***

اب ہم ایسے گم ہوئے پریم نگر کے شہر میں!
اپنے آپ نوں سودھ رہے ہیں نہ سر ہاتھ نہ پاؤں

میرا پہلا طواف ایک جنون کے عالم میں ہوا۔ دیوانہ وار چکروں کے درمیان۔ اس دوران شام قریب آتی جا رہی تھی۔ طواف ختم ہوا۔ کیسے اس کی خبر نہیں۔ امی جان نے مجھے طواف کے نفل ادا کرنے کو کہا خود فراموشی کے عالم میں طواف کے نفل ادا کیے پھر ہم اپنے راہنما بھائی نذیر کے ساتھ سعی کے لیے کوہ صفا و مروہ کی جانب چل پڑے گرمی کی شدت اور مائی ہاجرہ کی بے قراری' ننھا بچہ پانی کے لیے بلک رہا تھا ہر طرف ویرانہ۔ دور دور تک کہیں کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ بے آب و گیاہ میدان اور خشک پہاڑ ماں کا دل اس کی تڑپ کا امین تھا۔ بچہ اکیلا چھوڑنے پر بھی دل نہ مانتا تھا کہ مبادا کوئی جنگلی جانور بچے کو نقصان پہنچائے اور پانی حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ بالآخر روتے بچے کو لٹا کر وہ دوڑتی ہوئی کوہ صفا پر چڑھ گئیں گرمی کی شدت انہیں کہاں یاد تھی یاد تھا تو صرف اتنا کہ پانی حاصل کرنا ہے بچے کے لیے۔ مگر پانی نہیں مل رہا تھا۔ اسی تلاش میں کوہ صفا و مروہ پر دیوانہ وار چکر لگاتی رہیں۔ نیچے آتیں بچے کو دیکھتیں اور پھر پہاڑ پر چڑھ جاتیں۔ اسی بے قراری میں انہوں نے صفا و مروہ کے سات چکر لگائے ان کی یہ ادا خدا کو بہت پسند آئی۔ مامتا کی تڑپ اس کی مشکلوں کا حل بن گئی' واپس آئیں تو بچے کے بے قرار پاؤں کے نیچے پانی رواں ہو چکا تھا۔ زم زم "ٹھہر جا" پانی کی تیزی دیکھ کر بی بی فرمانے لگیں تو اس کی تندی میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ وہی زم زم وہی صفا مروہ مگر کتنا فرق پیدا کر دیا تھا۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ نے۔ جس صفا و مروہ پر ہم سعی کر رہے تھے۔ اسے جدید سہولتوں نے ہمارے لیے کتنا آرام دہ بنا دیا تھا۔ حجاج احرام باندھے سعی کر رہے تھے ہم قافلے کی عورتیں اکٹھی

سعی کر رہی تھیں اور مرد الگ' یوں تو وہاں مرد و زن کا کوئی فرق نہیں تھا۔ آگے پیچھے ادھر ادھر مرد اور عورت شانہ بشانہ چل رہے تھے ابھی سعی کے چار چکر ہی کٹے تھے کہ اللہ اکبر کی حیات افروز صدا نے قدم روک دیئے۔ جسم ساکت ہو گیا۔ وجود کا رواں رواں اس صدائے اول و آخر کو سنتے ہی کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں مسجد الحرام کی اذان نے روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اتنی روح پرور اذان کہ جس نے میرے چہار طرف روشنیوں کے جہاں آباد کر دیئے۔ جس نے جسم کے ہر تار کو بیدا کر دیا۔ سعی تھم گئی۔ لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں ایک آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ زبانیں گنگ مگر سماعتیں زندہ' اللہ اکبر کی صداؤں نے اللہ کے جاہ و جلال کو مجسم کر دیا۔ جدھر بھی کوئی تھا وہیں پر رک گیا۔ صفیں خود بخود درست ہوتی گئیں جگہیں بنتی گئیں۔ جبیں جھکنے لگی سجدے تڑپنے لگے' زندگی کی پہلی با جماعت نماز خانہ خدا میں ادا ہوئی۔ وہ نماز جو ہم نے بچپن میں سیکھی اور ہوش سنبھالے پر پڑھنی شروع کی' کبھی باقاعدگی اور کبھی بے قاعدگی سے وہ اذان جو عالم فانی میں آتے ہی سب سے پہلے کانوں میں گونجی وہ کچھ اور ہی تھی جو اذان اللہ کے بڑے گھر میں سماعتوں نے سنی کہنے کو تو اذان ہی تھی مگر ایسی اذان جو روح میں اتر کر ریشے ریشے میں سما گئی لہو میں گردش کر رہی تھی۔ خون کے ساتھ جسم میں دوڑ رہی تھی۔ بتا رہی تھی کہ اللہ بڑا ہے' اللہ بڑا ہے۔ ہاں اللہ بڑا ہے۔ میرے جسم کا تار تار پکار کر اس کی عظمت کا اعتراف کر رہا تھا اور میں ایک ہی دن میں اتنے بہت سے نئے رنگ نئی روشنیاں پا کے بے سدھ سی ہو گئی پھر پتہ نہیں کیسے رات گئے گھر تک پہنچی۔ پہلے دن کی تھکن بہت شدید تھی جسم کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت سے نکلی تو دیکھا۔ میرے سارے سنگی ساتھی جذبوں کو بیدار کیے جسم کو وضو کی تازگی سے سکون بخش رہے تھے ہم تقریباً سوا تین بجے تہجد کے لیے حرم شریف پہنچ گئے۔ حرم شریف میں دن کا سماں تھا۔ ایمان کی تجلیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ زندگی کے اندھیرے کہیں دور اپنا وجود گم کر چکے تھے اللہ کا گھر میرے سامنے تھا۔ میں جس رخ سے بھی چاہتی اس کا دیدار کر سکتی تھی ہم لوگ عورتوں کی صف میں جو خانہ خدا کے دروازے کے عین سامنے تھی بیٹھے تھے فرش پر سرخ نرم قالین بچھے ہوئے تھے اور

آس پاس میری ہی طرح کی خلقت۔ میرے ارد گرد بیٹھی ہوئی عورتیں بے تکان بولے جا رہی تھیں۔ سفر کی داستانیں' قیام کی مشکلیں اور بچوں سے جدائی کے قصے چھڑے تھے۔ ہر کوئی اپنی بساط بھر خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش میں تھی۔ ایسے میں دل بے اختیار چاہا ان کو چپ کراؤں انہیں بتا دوں کہ یہ وہ جگہ نہیں ہے۔ جہاں اس قسم کے خالص دنیاوی مسئلے چھیڑے جائیں۔ اری بے خبرو۔ یہاں آ گئی ہو تو یہاں کے آداب کا کچھ خیال کرو یہ جگہ جو آسمانوں اور زمینوں کے درمیان اک مقام خاص ہے اس کے سامنے۔ دنیا کی تمام نعمتیں اور محبتیں ہیچ ہیں تم لوگ کن خرابوں میں پڑ گئی ہو۔ کن الجھنوں میں ڈوب گئی ہو۔ ارے یہ قصے یہ مسئلے تو تمام عمر کے بکھیڑے ہیں یہاں پہنچ کر تو ان سے پیچھا چھڑاؤ۔ یہاں ذہن و دل کو پچھلی تمام محبتوں' تکلیفوں اور مسائل سے پاک کر لو۔ دیکھو تمہارے سامنے کیا ہے۔ تم لوگ کہاں آ گئی ہو۔ مقام دیکھو اپنے انداز دیکھو۔ قسمت کے یہ پل کتنے نصیب آور کتنے سرفراز ہیں۔ جو ہم سب کو مل گئے ہیں۔ ہمیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے یہ جو عقیدتوں' محبتوں کے انمول رتن یہاں جا بجا بکھرے ہیں۔ ان سے جھولیاں بھر لیں انہیں دونوں ہاتھوں سے سمیٹیں دلوں سے سمیٹیں غرض کہ یہاں تو ہمارا ایک ایک عضو یہ خزانے سمیٹنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے ادا کر سکتا ہے۔ مگر میرے دل کی دل میں رہیں نہ ان کی زبانیں رکیں نہ میری زبان کھلی۔ بس چپ چاپ اللہ کے گھر کو دیکھنے میں وقت گزر گیا یہاں تک کہ اذان فجر ہو گئی وہ بولتا چالتا مجمع خاموش ہو گیا۔ ہر طرف سکوت طاری ہو گیا۔ نماز شروع ہوئی۔ امام صاحب کی پر اثر آواز میں قرآت آس پاس کے ماحول اور حاضری کے شوق نے ایک ایسی لذت سے روشناس کرایا کہ پچھلی ساری زندگی اک ندامت بن گئی۔ زیاں کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ خسارے کا دکھ جسم و جان میں پھیلنے لگا۔ بہت سے گزرے برس کس بری طرح سے بے خبری کے عالم میں ضائع ہو گئے باقی کیا بچا۔ گناہ' عذاب' حسرتیں' ادھوری خواہشیں اور تنہا نمازیں' اکیلی نمازیں' بے چین نمازیں۔ زیاں کا احساس کچھ اتنا بڑھا کہ میرے سجدے پانی کی زد میں آ گئے۔ مکہ میں ہماری رہائش گاہ اللہ کی مہربانیوں اور بھائی نذیر کے وسیلے سے نہایت آرام دہ اور کشادہ تھی۔ حج کے دوران اچھی رہائش بہت ضروری ہے اور بہت

بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ وہاں عبادتیں، آنے جانے کی بھاگ دوڑ چھوٹے چھوٹے ضروری امور کی انجام دہی خاصے محنت طلب مسئلے ہیں۔ خاص طور پر ہم جیسوں کے لئے جنہوں نے زندگی میں آرام طلبی کو بہت شامل کر لیا ہے، ایئر کنڈیشنڈ کمروں، کاروں اور دیگر جدید سہولتوں نے ہمیں ست و کاہل بنا دیا ہے، ہم اپنے جسمانی سکھوں کی خاطر روحانی دکھ جھیلنے والے لوگ، ہم جیسے تن آسان وہاں کی دوڑ بھاگ، موسم کی تبدیلی اور آرام کی کمی سے پریشان ہو اٹھتے ہیں۔ مگر وہاں جذبوں کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے کہ آرام و آسائش گناہ لگنے لگا۔ لوگ فرش پر بستر بچھائے ضروری سامان رکھے جسمانی تکالیف سے قطعاً بے پرواہ رہ رہے تھے، وقت کے وقت نمازیں ادا کیں ہوٹل سے حسب استطاعت کھانا لے کر کھایا اور پڑ رہے۔ بعض لوگ تو مستقل حرم شریف میں قیام پذیر تھے۔ ضرورتوں کے لیے باہر آتے اس کے بعد پھر واپس، اللہ کا در اس کا گھر ہر خاص و عام کے لیے ایک سی سہولتوں کا مظہر تھا۔ جس کا دل چاہے رہے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ مگر کئی رہنے والے بڑی لاپرواہی کا ثبوت دے رہے تھے جگہ جگہ لیٹے ہوئے آرام کر رہے ہوتے اور اس آرام میں بسا اوقات پاؤں سیدھے بیت اللہ کی طرف ہوتے۔ جگہ جگہ پانی گرانا اور وقت بے وقت حرم شریف میں بیٹھ کر کھانے کی عادت کچھ اچھی نہ لگتی تھی۔ لوگوں کی لاپروائی کے باوجود حرم شریف کی صفائی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ صفائی کرنے والا عملہ ہر وقت آس پاس موجود رہتا۔ اور ہر وقت صفائی کا کام جاری رہتا تھا۔ سعودی عرب کی حکومت کا کام اور انتظام اتنا مکمل تھا کہ نظم و ضبط کا اہتمام لاکھوں کے انسانوں میں بھی قائم رہا۔ لاکھوں انسانوں کے لاکھوں مسائل کے حل وہاں موجود تھے۔ اک سلسلۂ حیرت تھا۔ جو ہم لوگ محسوس کرتے تھے۔ دیکھتے تھے مگر شاید بیان نہ ہو سکے کیونکہ بعض چیزیں عقل انسانی سے ماورا ہوتی ہیں اور چاہنے پر بھی انسان اس کی وضاحت نہیں کر سکتا اس لیے کہ وضاحتیں بعض اوقات حقیقی حسن کو بگاڑ کر اسے میک اپ زدہ کر دیتی ہیں اور میک اپ تو ایک دکھاوا ہوتا ہے۔ اور جذبوں کے معاملوں میں دکھاوؤں کا کیا مطلب۔ اس دن ظہر کی نماز برآمدوں میں ادا کی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نظر مرکز پر پہنچ کر واپس پلٹ نہ سکی۔ ہر طرف اللہ اللہ، اللہ ہی کا ورد، ہر اور اللہ ہی اللہ مجھے یوں

محسوس ہوا میرے دل کو پکڑ کر کوئی کھینچ رہا ہو کعبے کی اور، بے قراری کا عالم یوں طاری ہوا کہ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے بلا رہا ہے، چلی آؤ، چلی آؤ۔ ان آوازوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ آس پاس کا ماحول دھندلا گیا۔ پس منظر میں چلا گیا۔ ایک کعبہ تھا ایک میں تھی۔ حقیقت تھی سچائی تھی۔ وہ نور تھا میں خاک تھی۔ وہ آسمان تھا میں حقیر ذرّہ تھی۔ وہ مقام لامکاں تھا میں اس کی جویا تھی۔ وہ روشنی کا منبع تھا میں اندھیر نگری کی باسی تھی، وہ اللہ تھا میں اس کا بندہ تھی پھر وہ کونسی کشش، کیسی تڑپ کھینچے جاتی تھی۔ شاید اس معبود کو نزدیک سے جاننے کی کشش کھینچے تھی۔ شاید تڑپانے والے کو محسوس کرنے کی شدت تھی ننگے پاؤں کانپتا بدن، چھلکتے اشک، سہمے قدم، بے خودی کے لمحات آسمان بڑا روشن تھا۔ تپتی دھوپ کے لشکارے اور اپنا بے پرواہ وجود۔ برآمدے گزرے، سیڑھیاں گزریں صحن آ گیا قدموں کو ہوش نہ تھی کہاں پڑ رہے ہیں جسم کو خبر نہ تھی۔۔۔۔ شوق کی آگ تھی جو اڑائے چلی جا رہی تھی بے خودی دیوانہ وار چکروں میں ڈھل گئی اللہ کا گھر اور طواف سنا تھا۔ سات چکر ہوتے ہیں۔ ایک طواف کے، سات ہی ہوتے ہیں۔ مگر گنتی ان کو یاد ہوتی ہے جو ہر کام ناپ تول کے اصول کے تحت کرتے ہیں۔ جنھوں نے ایک ایک طواف کا حساب رکھنا ہوتا ہے جو ایک ایک چکر کو گنتی کی شکل میں یاد رکھتے تھے کہ طواف مکمل ہو جائے تو اسے طوافوں کی اس لڑی میں پرو لیا جائے جو واپس جا کر فخریہ اپنی عبادت کے نمونے کے طور پر لوگوں کو دکھانی ہے۔ فخریہ دکھانے والے اپنے نظریہ کے حساب سے ٹھیک ہیں کیونکہ وہ عبادتیں بجا طور پر فخر کئے جانے کے قابل تھیں۔ وہ عبادتیں تو زاد راہ ہیں ہمارے پاس۔ اس سے بھی بڑے سفر پر جاتے ہوئے کام آئیں گی مگر کیا کیجئے ہم سے دیوانوں کا۔ ان کے تو تمام کام خلاف معمول ہوتے ہیں۔ بے تکے ہوتے ہیں، اپنے طواف دیوانہ وار چکروں سے شروع ہوتے اور بعض اوقات مسلسل چلتے ہی رہتے وقت کے تعین کے بغیر۔ ہاں اذاں ہوتی تو دیوانگی فرزانگی میں خود بخود بدل جاتی بے چین روح اپنے خول میں واپس لوٹ آتی۔ طواف شروع ہوا کتنے چکر ہوئے شمار نہ کر سکی پاؤں چلتے رہے، فاصلے مٹتے رہے کئی دفعہ دوران طواف دیواروں کو چھو کر جنوں کی تندی کم کرنے کی کوشش کی۔ بہت دفعہ حجر اسود کے نزدیک جانے کی کوشش کی مگر موقع نہ

ملا۔ جب بھی قریب جاتی لوگ دھکیل کر پرے کر دیتے اور خود آگے ہو جاتے۔ یہ کیا میں سلگ اٹھی۔ یہ مانا میں اس قابل نہیں۔ یہ مقام میری حقیر ذات سے بہت ارفع ہے۔ مگر بلاوا آیا ہے باقاعدہ دعوت نامہ بھیجا گیا تھا۔ اگر یقین نہیں آتا تو دیکھ لو لوگو میرے پاس ثبوت ہیں شہادتیں ہیں جو کہ تمہاری دنیا میں بہت اہمیت رکھتی ہیں گو کہ مجھے وہ سب رسمیں ہی لگتی ہیں وہ اگر نہ بھی ہوتیں تو بھی میں آتی کیونکہ مجھے آنا تھا' یہاں میری روح بندھی تھی۔ یہاں میرا دل اٹکا ہوا تھا مجھے آنا تھا اپنے روح و دل کی ضرورتوں کے تحت شاید انہی ضرورتوں پر ترس کھا کے بلاوہ بھیجا گیا تھا مجھے' مت اتراؤ اپنی عبادتوں پر کیا ہوا اگر میں کچھ نہ کر سکی۔ دیوانی جو ٹھہری پیا کے گھر کی اور دیوانے تو بہرحال دیوانے ہوتے ہیں۔ میرے طواف میرے دیوانے چکر ہی سہی مگر ٹوٹتے جسم اور شل ہوتے ہوئے پاؤں کے ساتھ لگی رہتی ہوں ایسے آرام ملتا ہے۔ یہاں بہت سکھ ہیں کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ کوئی خاص و عام نہیں کوئی کسی پر برتر نہیں ایک ہی جگہ سجدہ کرتے ہیں سب۔ اور ایک ہی جگہ پھیرے لگاتے ہیں یہ دنیا کتنی حسین ہے کتنی پرسکون ہے یہاں پہنچ کر تو تن کے سارے آلام کہیں کھو گئے ہیں' روح کے تمام بوجھ ہلکے ہو گئے ہیں مگر یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم لوگ مجھے اس سیاہ پتھر کو چھونے نہیں دیتے جو اوپر سے اتارا گیا ہے۔ عجیب بے بسی کا عالم طاری تھا اپنی سی ہر کوشش کر ڈالی مگر سب بے سود ایسے میں نہ جانے کس مہربان کا دھکا لگا کہ میں اس بھیڑ پر جا پڑی جو سیاہ پتھر کے آگے جمع تھی ابھی اٹھ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک سخت آواز کانوں میں گونجی' یللہ حج گم یللہ گم گم۔ میں نے آواز کی سمت بے اختیار دیکھا تو پہلے دن کے درس والا نوجوان خادم کھڑا تھا۔ چہرے پر درشتی' لہجے میں سختی۔ آنکھوں میں غصہ سرخ عمامے کی اوٹ سے جھانکتا اس کا سانولا چہرہ بے پناہ سختی ظاہر کر رہا تھا۔ گم گم جب اس نے مجھے صم بکم دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھ جانے کو کہا۔ مگر میں ایک چپ کے عالم میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ابھی دوریوں کے سلسلے قائم تھے۔ تدبیریں شاید تقدیروں کے آگے دم نہیں مار سکتیں اس لیے کہ تقدیریں زور آور ہوتی ہیں اور ان کی بساط پر تدبیروں کے مہرے مات ہو جاتے ہیں۔ اس ہجوم عاشقاں کی بھیڑ میں میرا درد مجھے تڑپا رہا تھا مجھے چپ چاپ کھڑے دیکھ

کر میرے ستم گر کو اور بھی غصہ آگیا وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آگے بھیڑ میں دھکیل دیا۔ جانے اس ظالم کی نظر بار بار ستمگری کے لیے مجھ پر ہی کیوں پڑتی تھی شاید اس لیے کہ میری طلب میری سمجھ سے بالا تر تھی۔ اور میں اس ضمن میں دیوانگیاں کرتی رہتی تھی۔ ایک چکر پورا ہوتے ہی پھر طلب کی راہوں میں آن کھڑی ہوئی۔ لوگوں کے ہجوم میں خود کو چھپانے کی کوشش کی کہ پھر ان روشن نظروں میں نہ آجاؤں۔ میرے بھائیو۔ عورتوں کو پہلے بوسہ لینے دیں یہ کب سے کھڑی ہیں۔ مردوں کے مجمع سے کسی مہربان کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے کہنے والے نجات دہندہ کی طرف دیکھا تو حجر اسود کے آگے ایک نوجوان آدمی کھڑا پایا جو اپنے بازوؤں سے حجر اسود کو گھیرے مردوں کے آگے ڈھال بنا کھڑا تھا اور عورتوں کو جلدی جلدی آگے آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ کتنے مہربان اور خوبصورت دل کا مالک تھا وہ۔ عورتوں کی دھکم پیل میں آگے کھسکتی میں نزدیک پہنچ گئی۔ ایک بی بی بوسے کی غرض سے حجر اسود پر جھکی ہوئی تھی کہ معاً ایک دوسری بی بی نے پیچھے سے ان کو کھینچ کر خود آگے ہونا چاہا۔ اس کوشش میں جھکی ہوئی بی بی کا دوپٹہ جو کہ بہت پتلا سا تھا سر سے اتر گیا۔ وہ آدمی جو اس مہربانی کا باعث تھا اس نے ناگواری سے کھینچنے والی کی طرف دیکھا۔ دیکھئے بی بی میں آپ کو بوسہ دلانے کی غرض سے ہی یہاں کھڑا ہوں۔ جب تک آپ فارغ نہ ہو جائیں میں یونہی کھڑا رہوں گا مگر آپ اتنی جلدی نہ کیجئے کہ پردہ کا احترام ہی ختم ہو جائے۔ وہ محترمہ شرمندہ سی ہو کر پیچھے ہٹ گئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر ان بی بی کے سر پر دوپٹہ ڈالا اور خود موقع غنیمت جان کر جلدی سے شگاف میں منہ ڈال دیا۔ پتھر کی سختی اور تقدس میرے روئیں روئیں میں پھیل گیا۔ میرے آنسوؤں کی نمی اس میں بکھر گئی۔ وہ سرد سخت پتھر بھی میری بیچارگی پر رو پڑا۔ اس کے آنسو میرے آنسوؤں سے مل کر میرا غم بانٹنے لگے اور میں اپنے غم خوار کے لمس کو اپنے ہونٹوں میں بسائے وہاں سے ہٹ آئی۔ ہمیں مکہ میں پانچ دن ہو گئے تھے۔ پانچ دن، پانچ جگ یا پانچ لمحے۔ دنوں کے پنچھی پنکھ بکھیرے وقت کی آغوش میں اڑتے جا رہے تھے ہر دن ایک نیا احساس لیے طلوع ہوتا اور جاتے جاتے اپنی جھولی میں بہت سی نئی خوشبوئیں چھوڑ جاتا۔ صبح صادق کے وقت نماز کے لیے گھر سے نکلتے تو عجیب سجی سجائی دنیا کا

سامنا ہوتا۔ ہر طرف روشنیاں' ہر طرف گہما گہمی۔ سارے ہوٹل اور بازار کھلے ہوتے۔ تنور والا بھی اپنا تنور گرم کیے دھڑا دھڑ روٹیاں لگانے میں مصروف ہوتا۔ تنور ایک دوکان نما کمرے میں لگا ہوا تھا۔ جو کافی کشادہ تھا۔ تنور ہمارے گھر کے نیچے تھا ہم جب بھی گھر سے نکلتے تو سب سے پہلے اس تنور والے کی دوکان کا ایگزاسٹ فین گرم ہوا سے ہمارا استقبال کرتا۔ گلی سے نکلتے تو سڑک پر لوگ ٹولیوں کی صورت میں حرم شریف جا رہے ہوتے ہلکی ہلکی سیاہی و سفیدی کا امتزاج۔ بتیوں کی جھلملاہٹ جویائے حق کے قافلے۔ الحرم کے میناروں کی عظمت ٹھنڈی ٹھنڈی مست کر دینے والی ہوائیں۔ صبح اتنی خوبصورت اتنی پرُنور ہوتی کہ دل چاہتا اس صبح کی شام نہ ہو۔ باجی ثریا کو فلو ہو گیا پہلے تو نزلہ و زکام کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے معمولات کو انجام دیتی رہیں۔ مگر آخر کار بخار نے ان کو چت کر ڈالا پاکستان ہاؤس ڈاکٹر کے پاس گئے۔ لیڈی ڈاکٹر جو کہ اپر سٹوری میں تھیں ان کے پاس پہنچے تو ایک باوقار اور معتبر سی لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کو بیٹھا ہوا پایا ان کے پاس مریضوں کا کافی رش تھا۔ مگر وہ بڑے تحمل سے سب کا چیک اپ کر رہی تھیں۔ اپنی باری آنے پر باجی نے اپنا چیک اپ کرایا انہوں نے بڑے دھیان سے دیکھا اور دوائی لکھ دی ہم لوگ دوائی لینے کے لیے ڈسپنسری جو کہ ساتھ ہی دوسرے کمرے میں تھی' گئے۔ تو ایک قدرے فربہ مگر باتونی سی ڈسپنسر کو کھڑے پایا۔ انہوں نے دوائیوں کی لسٹ دیکھی اور لاتعداد رنگ برنگی دوائیاں میز پر ڈھیر کر دیں۔ آیئے اس نے مجھے بلایا اور دوائیوں کے استعمال کا طریقہ جلدی جلدی بتایا۔ میں نے نسخے کے مطابق دوائیاں پکڑیں یہ بھی پکڑیں' انہوں نے میز پر رکھی ہوئی باقی دوائیاں بھی اٹھائیں اور مجھے دینے لگیں مگر اتنی بہت سی دوائیوں کا ہم کیا کریں گے۔ میں نے بہت سی شیشیوں کا ڈھیر دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ارے بھئی ایک ایک دوائی کی تین تین بوتلیں ہی تو ہیں۔ اب اگر ایک ختم ہو گئی تو پھر دوڑی دوڑی آؤ گی۔ لہٰذا اس سے بہتر ہے کہ اکٹھی لے جاؤ سب دوائیاں تمہارے پاس موجود ہوں گی تو خود بخود ایک ختم ہونے کے بعد دوسری شروع کر لینا انہوں نے تفصیل سے ان تمام دوائیوں کا مصرف مجھے بتلایا۔ نہیں نہیں سسٹر ہم اتنی دوائیوں کا کیا کریں گے۔ معمولی نزلہ بخار ہے انشاء اللہ انہی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی

ہوئی دوائیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ دوائیاں آپ دوسرے ضرورتمندوں کو دے دیں اگر خدانخواستہ ہمیں دوبارہ ضرورت پڑی تو ہم پھر لے لیں گے"۔ پہلے تو وہ حیرت سے مجھے دیکھتی رہ گئیں پھر قریب سے گزرتی ہوئی ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر کو آواز دی۔ کیا بات ہے سسٹر۔ لیڈی ڈاکٹر نے رک کر پوچھا۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحبہ یہ عجیب محترمہ ہیں۔ اپنا بھی وقت ضائع کر رہی ہیں اور ہمارا بھی کیوں کیا ہوا۔ میں نے انہیں اس نسخہ کے مطابق دوائیاں دیں اور ہر دوائی کی تین تین شیشیاں ساتھ مزید دے دیں اس لیے کہ اتنی دوائیاں پیشنٹ کے لیے ضروری ہیں اور میں نے سوچا انہیں دوائی کے لیے یہاں دوبارہ نہ آنا پڑے مگر یہ مانتی ہی نہیں کہتی ہیں کہ مجھے اتنی دوائیوں کی ضرورت نہیں آپ کسی اور ضرورت مند کو دے دیں۔ مجھے اگر دوبارہ ضرورت پڑی تو میں آ کے لے جاؤں گی۔ سسٹر نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی ارے بھئی تم نہیں جانتی ان لوگوں کی فطرت کو، ان کو کوئی چیز مفت میں بغیر محنت کے مل جائے تو یونہی بے قدری کرتے ہیں۔ یہی دوائیاں اگر انہیں خریدنا پڑتیں تو احساس ہوتا۔ رکھ دو تم دیکھنا یہی محترمہ دوبارہ آئیں گی یہی دوائیاں لینے کے لیے۔ ان لوگوں کو چکر لگانے شاید اچھے لگتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر صاحبہ بڑی بیزاری اور رعونت سے بولیں اور میں، جو پردیس میں ان قیمتی دواؤں کے زیاں کے ڈر سے انہیں لینے پر آمادہ نہ تھی —— لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کے ہاتھوں کافی درگت بن جانے کے بعد شرمندہ سی واپس آ گئی باجی کا بخار تین چار دنوں پر پھیل گیا ہر آنے والا دن صحت کی امید لیے طلوع ہوتا اور مایوسی پر ختم ہو جاتا۔ ہم لوگ اپنے معمولات باقاعدگی سے نبھا رہے تھے باجی سارا دن لیٹی رہتی بعض اوقات تو انہیں دوائی بھی دینے گھر نہ آ سکتے تھے۔ وقتاً" فوقتاً" گھر آ کے ان کو دیکھتے ان کی دوائی وغیرہ کا دھیان رکھنے کی کوشش کرتے۔ مگر وہاں کا وقت اتنا تیز تھا کہ ہاتھ ہی نہ آتا تھا چاہے جتنی کوشش بھی کرتے پکڑنے کی ہاتھوں سے نکلا جاتا۔ یا پھر ہم لوگ ہی وقت کے بارے میں زیادہ حساس ہو گئے تھے کیونکہ ہر بیتنے والا دن ہمیں وقت کے چلے جانے کا احساس دلاتا ہر جانے والا پل ہمارے قیام کی مدت کو گھٹانے کا سبب ہوتا اور آنے والی جدائیوں اور فرقتوں کی تندی بعض اوقات اذیت ناک ہوتی ہم وہاں حاصل ہونے والے لمحے لمحے سے اپنی گم شدہ زیست کی شناخت حاصل کرنا

چاہتے تھے مگر لمحے تھے کہ روٹھے محبوب کی طرح ہاتھ ہی نہ آتے تھے۔ باجی کی علالت نے ہمارا مدینہ جانے کا پروگرام التوا میں ڈال دیا۔ پروگرام کے مطابق ہم لوگوں کو فریضہ حج سے پہلے طیبہ جانا تھا اور وہاں سے واپسی پر حج کی ادائیگی کرنا تھی۔ مگر باجی کی طبیعت کی ناسازی ہمارے جانے میں تاخیر کا سبب بن رہی تھی۔ خدا خدا کر کے چار دن بعد باجی ٹھیک ہوئیں تو کچھ امید سی بندھی۔ ادھورے خواب کروٹیں بدلنے لگے۔ سوختہ جان ناامیدی کے صحرا میں جلتے جلتے پھر سے امید نخلستان میں جینے لگی دل کی ٹھہری سی کیفیت پھر سے متلاطم ہونے لگی۔ کیفیت تو گھٹا ہے' باد باراں ہے مدو جزر ہے' کیفیت تو رنگ نور ہے روشنی ہے۔ کیفیت تو سر پھری آوارہ بادلوں کی طرح ہے کبھی برسنے پر آمادہ کبھی ترسانے پر تیار۔ اپنی وہ متلاطم کیفیت سرگوشیاں کرتی ہوئی کہہ رہی تھی چلو' چلو کہ در محبوب کی سلامی کو چلیں۔ چلو چلیں کہ شان مدینہ بلا رہی ہے بچھڑی تڑپتی محبتوں کا پیام دے رہی ہے' چلو مدینہ کہ زندگی تم کو وہاں بلا رہی ہے زندگی کا پیام زندگی کی ضرورت بن گیا تھا۔ پھر کچھ یوں بھی رخش عمر کی تیزی کا احساس شدت اختیار کرتا جا رہا تھا ہرجائی وقت کی کج ادائیوں کے تیور بگڑے بگڑے سے تھے۔ ڈرپوک دل سہمی چڑیا کی طرح جسم کے پنجرے میں دبکا پڑا تھا۔ گھر سے چلتے وقت مدینے کی تانگیں دل میں جھیڑے ڈالے ہوئیں تھیں۔ ہر گھڑی ہر لمحہ دیار حبیب کی کشش دل کی کسک کا باعث بنی رہتی۔ ہر گزرنے والا دن عمر کے کم ہونے اور جدائیوں کے زیادہ ہونے کا احساس تیز کر دیتا۔ زندگی، ہر لمحہ افسردہ و ملول رہنے لگی تھی۔ ہر پل ملال کا پل ہر لمحہ زیاں کا احساس اس احساس کی تندی سوئے حرم آ کر دھیمی پڑ گئی وہ چنگاری جو عمر کو ہولے ہولے سلگائے جا رہی تھی۔ مدھم پڑ گئی۔ اللہ کے بڑے گھر کو دیکھتے ہی تمام حسرتیں مٹنے لگیں۔ بے قراریاں سکوں پذیر ہونے لگیں۔ شدتیں کم ہونے لگیں اور دل کی دنیا میں کچھ ٹھہراؤ سا آنے لگا۔ حرم شریف میں بیٹھی تھی عصر کی نماز کا وقت قریب تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی طواف کر کے نماز کے لیے آئی تھی اور کعبتہ اللہ پر نظریں جمائے ماحول سے بے خبر ارد گرد سے لاپروا اپنے شغل میں مصروف تھی وہاں جو بھی پل ملا زباں کو کم سے کم کھولنے کی کوشش کی۔ حرم شریف میں باتیں کرنے اور ارد گرد کے ماحول میں دلچسپی لینے کو دل نہ چاہتا

تھا۔ پس جو بھی گھڑیاں ملتیں وصال کی جستجو میں کٹ جاتیں۔ خاموشی سے بیٹھی اپنے کام میں مصروف تھی کہ کسی نے میرا شانہ پکڑ کے مجھے ہلایا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو ایک ہندوستانی خاتون مجھ سے مخاطب تھی بیٹی میں نے تجھے ایک دو مرتبہ بلایا مگر شاید تم سن نہ سکیں اس لیے مجھے تم سے بات کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ جی فرمایئے میں نے واپس لوٹتے ہوئے کہا۔ اکیلی ہو۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ جی آپ کو یہ خیال کیونکر آیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس لیے بیٹی کہ میں کب سے تمہیں دیکھ رہی تھی تم گم سم چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس لیے میں نے پوچھا ہے۔ انہوں نے میرے چپ چاپ بیٹھنے کا جواز خود ہی پیدا کر لیا تھا۔ جی نہیں میرے ساتھ میری امی، بہن اور خالائیں ہیں پھر اس طرح کیوں بیٹھی ہو وہ حیرت سے بولیں۔ دراصل اندر آتے وقت دروازے پر بھیڑ بہت تھی اس وجہ سے میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے اور میں یہاں جگہ ملنے پر بیٹھ گئی۔ میں انہیں کیا بتاتی کہ میں کیوں الگ تھلگ بیٹھی ہوں میں کیسے کہتی کہ مجھے میری تنہائی اپنے رب کے درمیان رابطہ محسوس ہوتی ہے۔ میرے طواف عموماً تنہا ہوتے۔ میں بہت کم ساتھیوں کے ساتھ طواف کرتی۔ کیونکہ میرے طواف بعض اوقات گنتی کی حدوں سے تجاوز کر جاتے میرے سجدے خود اپنے ہی پسینے میں بھیگ جاتے میری دید کی پیاس کی تشنگی بڑھ جاتی۔ زبان اپنی شرمندگیوں کے بار تلے دب جاتی ایسے میں اتنی بہت سی مشکلوں کے ساتھ میں کیسے اور کیوں کر اپنوں کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی۔ نارمل لوگوں کے ساتھ زبردستی نارمل ہونے کی کوشش کرنا پڑتی ہے اور وہ کوشش میرے جسم و جان کو مہنگی پڑتی تھی ان سب کے ساتھ ان کی مرضی پر چلتے ہوئے خود کو قیدی سا محسوس کرتی۔ اور وہاں پہنچ کر قید مجھے گوارا نہ تھی۔ قید و بند کی سختیاں اپنی دنیا میں برداشت کی جا سکتی ہیں۔ مگر اس مقام خاص پر ان کا تصور بھی اذیت ناک تھا۔ میں اس خاتون کی بات کا جواب دیتے دیتے کچھ کھو سی گئی۔ اچھا میرے جواب پر وہ کچھ مطمئن ہوتے ہوئے بولیں۔ تو گھر اکیلی پہنچ جاؤ گی ان کا سوال مجھے پھر سے گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کہتی اماں جی ایسی قسمت کہاں کہ یہاں گم ہو سکوں، مگر میرے منہ سے ان کے سوال کا جواب نکل ہی گیا۔ جی مجھے پتہ ہے اور میں بخیریت پہنچ

جاؤں گی۔ دوسرے ہم لوگوں نے ایک مقام جو کہ حرم شریف کے پاس ہے۔ ایک دوسرے کو بتایا ہوا ہے۔ لہٰذا ہم لوگ پہلے وہاں رک کر ایک دوسرے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اکٹھے گھر جاتے ہیں ہاں یہ ٹھیک ہے وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولیں کیونکہ عام طور پر انجان لوگ کھو جاتے ہیں۔ اماں جی کی باتوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا اور میری زبان اپنی عادت کے ٹوٹنے پر مجبور نظر آتی تھی۔ مدینہ سے ہو آئیں' سوال؟ سوال کیا تھا اک آگ تھی جو دل میں بھڑک اٹھی۔ بھڑ بھڑ بھڑ میرا وجود ہجر کے شعلوں میں جلنے لگا۔ مدینہ طیبہ بھولے ہوئے سپنے پھر سے آنکھوں میں سمانے لگے۔ جدائیوں کے کانٹے آنکھوں میں چبھنے لگے طیبہ کی اور چلنے کا خواب اک عمر کی تشنگی تھی۔ ایک جنم کی پیاس تھی طیبہ کے ذکر پر دل کی دنیا میں سیلاب سا آ جاتا دل ہجر کے پانیوں کے زد میں آ کر بہنے لگتا۔ فراق کی گھڑیاں صدیوں پر پھیل جاتیں۔ ملن کی تمنائیں تن کی نگری میں ہر طرف ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں مگر ملن کے رستے بہت مخدوش تھے۔ پھر امید بندھی زندگی کی گاڑی میں حاضری کا ایندھن پڑا اور گاڑی چل پڑی سوئے حرم۔ وہاں پہنچ کے ظرف کے دامن کو سرفرازی کی اتنی دولتیں ملیں کہ میں کم ظرف بھول ہی گئی میرا مقصد دیار حبیب بھی تھا۔ میرے درد کا مداوا طیبہ کی خاک بھی تھی' ان اماں جی کا سوال یوں ذہن میں بگولا بن کر اٹھا کہ میں بے قرار ہو گئی۔ رات کو گھر پہنچتے ہی میرا سب سے پہلا سوال تھا مدینہ منورہ کب جا رہے ہیں۔ کھانا کھا لو پھر آرام سے بیٹھ کر پروگرام بناتے ہیں۔ بھائی قاسم نے کہا۔ کھانا کھانے سے پہلے پروگرام نہیں بن سکتا کیا۔ میں نے تقریباً بحث کرتے ہوئے کہا۔ بن سکتا ہے ضرور بن سکتا ہے۔ مگر ہم کھانے کے بعد بنائیں گے بھائی قاسم شاید مجھے تنگ کرنے کے موڈ میں تھے یا میں کچھ زیادہ بیتاب تھی۔ بھائی نذیر آپ بتائیں ہم کب جائیں گے۔ وہاں سے نا امید ہو کر میں نے بھائی نذیر کی طرف رجوع کیا جب سب کا پروگرام بنے گا تو چل دیں گے۔ بھائی نذیر نے گول مول سا جواب دیا کیا مطلب ہے تو کیا آپ کی ذاتی رائے کوئی نہیں' میں تقریباً لڑ پڑی میری ذاتی رائے آپ سب کی رائے ہے اگر آپ سب کا پروگرام اب بنے تو میں ابھی چل دونگا انہوں نے وضاحت کی۔ آپ بھی عجیب ہیں نذیر بھائی کوئی بات بھی واضح نہیں بتاتے۔ بھائی قاسم کو بھوک لگی ہے۔ لہٰذا وہ کھانے

سے پہلے کوئی بات کرنا نہیں چاہتے۔ آپ گول مول باتوں سے ٹال رہے ہیں۔ تو آخر کوئی سنے گا بھی۔ میں جھنجلا اٹھی میں چاہتی تھی اس وقت سارا پروگرام فائنل ہو جائے آخر بھائی نذیر امی سے بولے آپ ہی بشریٰ کو بتا دیں کیا پروگرام ہے بڑی بے چین لگ رہی ہے' یہ بات انہوں نے مذاق میں کی مگر اس وقت وہ بات حقیقت تھی۔ میری حالت واقعی اس بچے کی سی ہو رہی تھی جسے کھلونے کا لالچ دے کر بہلایا جاتا ہے اور جب وہ کھلونا مانگتا ہے تو کھلونے کو حاصل نہیں کر سکتا۔ امی بولیں آپ سب اگر تیار ہوں تو پھر ہمیں جلد ہی چل دینا چاہیے۔ کب تک امی' میں جلدی سے بولی۔ اگر تم کہتی ہو تو کل ہی' امی مسکراتے ہوئے بولیں۔ صبح ہماری تیاری تھی ہم لوگوں نے پہلے جدہ اور اس کے بعد مدینہ جانا تھا۔ جدہ سے بھائی نذیر نے اپنے لیے اجازت نامہ حاصل کرنا تھا۔ مدینہ جانے کا' کیونکہ حج کے دنوں میں وہ اجازت نامہ کے بغیر مدینہ شریف نہیں جا سکتے تھے ہمارا پروگرام بھائی نذیر کے ساتھ مدینہ جانے کا تھا۔ اس لیے پہلے جدہ جانا پڑا ہمارے اس سفر عظیم میں ہمارے معلم کے فرائض بھی بھائی نذیر نے ادا کئے جو معلم حکومت کی جانب سے نامزد کیا گیا تھا۔ اسے ہم نے دوران قیام کہیں نہیں پایا ہم لوگ ان گروپوں میں شامل نہیں تھے جو حکومت پاکستان نے حجاج کی سہولت کے لیے پاکستان میں بنائے تھے۔ ہم اپنے طور پر اپنے چھوٹے سے چھ نفوس کے قافلے کے ساتھ اس سفر پر نکلے تھے اور کیونکہ ہمارے سپانسر بھائی نذیر تھے۔ اس لیے ہم با آسانی ان تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے جو کہ وہاں ضروری تھیں۔

***

تانگھ ماہی دی جلی آں

ہم لوگ سہ پہر کو جدہ پہنچے۔ اس دن باجی کا فلو میری طرف رجوع کر چکا تھا اور خوب مہربانیاں دکھا رہا تھا۔ پہلے تو گلے میں درد شروع ہوا۔ میں نے فوراً حفظ ماتقدم کے طور پر دوائی کھالی۔ دوائی نے اثر تو خیر کیا کرنا تھا الٹا کھانسی بھی شروع ہو گئی اور پھر کھانسی ایسی شدید شروع ہوئی کہ ساتھ ہی قے کی مصیبت بھی نازل ہو گئی۔ گلے میں کانٹے سے چبھنے لگے آنکھیں لال سرخ ہو گئیں۔ اور ان میں سے پانی بہنا شروع ہو گیا۔ سر میں درد' جسم میں درد اور چکر کچھ اس قدر اچانک۔ سب تکالیف شروع ہوئیں کہ میں بے حال ہو گئی فوراً دوائیاں شروع کر دیں۔ مگر کچھ فرق نہ پڑا۔ بھائی نذیر اپنے کاغذات کے سلسلے میں باہر چلے گئے اور دوسرے ساتھی سامان کی تیاری میں لگ گئے اور میں خوشیوں اور امنگوں کے اس سفر کی ابتدا میں ہی ٹوٹنے پھوٹنے لگی دن کی روشنی پر شام کی سیاہی چھانے لگی دن جو مدینہ کی مسرتوں اور تن کی بے حالی میں بیت گیا۔ میں مسلسل کھانس رہی تھی کھانسی کی شدت سے آواز بند ہوئی جا رہی تھی۔ بار بار خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ اے پالنے والے مجھے تن کے آزار سے نجات دلا مجھے جسم کا سکھ عطا فرما کہ میں روح کو سکھ کے ساگر میں اتار سکوں۔ شام کو بھائی نذیر آئے اس خبر کے ساتھ کہ انہیں اجازت نامہ نہیں ملا جس آدمی سے اجازت نامہ حاصل کرنا تھا وہ شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور تین چار یوم کے بعد اس کی آمد متوقع تھی۔ ہم جانے کے انتظار میں پر تولے بیٹھے تھے ان کی آمد پر یہ سن کر تذبذب میں پڑ گئے۔ ہمارا سارا پروگرام اور تمام مسئلے مسائل بھائی نذیر کے ذمہ تھے ہم تو ایسے مطمئن تھے جیسے پردیس میں نہیں اپنے گھر بیٹھے ہوں ان کے نہ جانے کا سن کر سب سوچوں میں پڑ گئے۔ پھر کیا خیال ہے امی۔ امی جان جو پہلے بھی سفر مبارک کر

چکی تھیں اور ہمارے گروپ میں سب سے بڑی ہونے کے ناطے ان کی رائے کو صائب خیال کیا جاتا تھا وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ آپس میں سب مشورہ کر لو کیونکہ نذیر کو معلوم نہیں کب کاغذات ملیں اس وقت تک ہمارا محدود وقت ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم مزید دیر نہ کریں۔ بھائی نذیر خاموشی سے بیٹھے تھے کہنے لگے اماں آپ لوگ سوچ بچار میں وقت ضائع نہ کریں میرا کام خبر نہیں کب ہو آپ لوگوں کا وقت بہت قیمتی ہے۔ یونہی انتظار میں ضائع نہ ہو جائے آپ چلنے کی تیاری کریں۔ ہم نے رخت سفر باندھا اور بس سٹاپ کی طرف چل دیئے۔ شام ہولے ہولے پھیلتی جا رہی تھی جدے کی سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی میں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی خوابوں کے شہر کی شروعات سرخ آنکھوں اور زخمی گلے سے کر رہی تھی۔ مجھے یاد آ رہا تھا۔ بچپن میں جب بھی گھر میں کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو اس کی بے انتہا ناز برداریاں ہوتیں یوں جیسے اس کے علاوہ گھر میں اور کوئی بھی توجہ کے قابل نہ ہو۔ سب کو اس کے پاس دل بہلانے کے لیے بٹھایا جاتا زبان ہلانے سے پہلے ہر چیز حاضر خدمت ہوتی اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دی جاتی۔ اور ایسے میں جب دوائی دینے کا وقت آتا تو رنگ برنگی چیزوں کے ڈھیر لگا دیئے جاتے۔ اپنے گھر میں بیمار کی اتنی زبردست ٹریٹمنٹ اتنی آؤ بھگت مجھے ہمیشہ رشک میں مبتلا کر دیتی کیونکہ جب مجھے بیمار کا جی بہلانے کو دوسرے لفظوں میں نخرے سہنے کو بھیجا جاتا تو جی جل جاتا۔ کیا مصیبت ہے جو محترم معمولی نزلے بخار سے اتنے نازک بن رہے ہیں کل تک ہماری خوشامد کرتے تھے۔ آج معمولی بخار کیا ہوا کہ حکم چلانے لگے ہیں۔ یہ کرو وہ کرو ان کی فرمائش ہی پوری نہیں ہوتی ایسے میں بیماری بہت بڑی نعمت لگنے لگتی واہ بیماری میں تو بڑے مزے ہیں اے کاش کوئی اچھی قسم کی بیماری مجھے بھی لگ جائے۔ میں بڑے خشوع و خضوع سے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھائے آسمان کی طرف منہ کیے دعائیں مانگتی مگر افسوس کہ وہ معصوم نتائج سے بے خبر دعائیں کبھی بھی پوری نہ ہوئیں میں بیماری کو پاس بلانے کی جتنی بھی ترکیبیں سوچتی اتنا ہی بیماری مجھ سے دور بھاگتی اور اس آنکھ مچولی میں بچپن کے سہانے دن بیت گئے مگر اب بھی جب کبھی تھکاوٹ و سستی کا دورہ پڑے اور گھر میں خاطر خواہ آرام نہ ملے تو وہی دعا چپکے سے

ہونٹوں پر آ جاتی ہے اور دعا مانگنے کے بعد اپنی حماقت پر ہنسی بھی کہ شاید ذہن میں ابھی بھی بچپن کی یادوں کے انمٹ نقوش ان بیتی گزری خواہشوں کے ساتھ قائم ہیں۔ اس دن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اپنی مانگی ہوئی تمام دعائیں پوری ہو گئی ہوں۔ وہ بیمار ہونے کی تمنائیں جو بچپن سے دل میں تھیں سب اکٹھی قبول ہو کر مجھ پر وارد ہو گئیں تھیں۔ شام کو تقریباً چھ بجے ہم جدہ کے بس سٹاپ پر پہنچے اور سامان وغیرہ رکھ کر انتظار گاہ کی آرام دہ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ٹکٹ رات آٹھ بجے کے تھے۔ درد نے جسم میں ہلچل مچائی ہوئی تھی۔ میں نے چائے کے ساتھ بہت سی دوائیاں نگل لیں۔ مغرب کی نماز ہم نے بس سٹاپ کی انتظار گاہ میں ادا کی اور پھر لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا (آؤ مدینہ کو جانے والو تمہیں بہاریں بلا رہی ہیں۔ حیات کی سب حسین کلیاں تمہیں سجانے کو آ رہی ہیں۔ چلو کہ زیست کے لمحوں کو اپنا کر لو۔ اندھیری راہوں کو روشنی کا لبادہ دے کر نئے سفر کا آغاز کر لو۔ چلو مدینے کہ جسم و جان کی تھکن اتاریں، اداس روح کی گھٹن اتاریں۔ چلو مدینے کو جانے والو تمہیں بہاریں بلا رہی ہیں) مضمحل جسم، مضطرب روح اور دھڑکتے دل کے ساتھ میں اٹھ کھڑی ہوئی ہم سب اپنا اپنا سامان اٹھائے بس کی سمت روانہ ہوئے۔ بھائی نذیر نے بس میں سامان رکھوا دیا۔ نئی نویلی بس رات کے اندھیرے میں جگمگاتی روشنیوں سمیت کھڑی تھی۔ بسم اللہ پڑھ کر بس میں قدم رکھا اور کھڑکی کے پاس والی سیٹ سنبھال لی۔ باجی ثریا اور میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ بس اپنے پورے وقت پر یعنی آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ الوداع کہنے والوں پر رخصتی نگاہ ڈالتے ہوئے ہم چل پڑے۔ جدہ اپنی جدیدیت اور پھیلاؤ میں بہت بڑا شہر ہے۔ ہماری بس الطریق مدینہ منورہ پر دوڑ رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ مگر جدہ کے کوچہ و بازا نہ گزر پائے تھے سڑک کے کنارے بڑی بڑی مارکیٹیں اور ان میں رنگا رنگ چیزیں رات کو دن کی سی روشنی۔ سامان تعیش سے بھری ہوئی دکانیں، خوبصورت مارکیٹوں، بازاروں اور مسجدوں کا شہر جدہ۔ جدیدیت اور نئے دور کی روشنی کا منہ بولتا ثبوت جدہ۔ گزرنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے سوا آٹھ بجے ہم شہر سے نکلے ہمارا قافلہ دیار حبیب کے راستوں پر چل نکلا۔ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کا شور ترنم بکھیر رہا تھا۔ آگے آگے میر کارواں

اپنے اونٹ کی مہار پکڑے رہنمائی کر رہا تھا۔ پیچھے پیچھے قافلہ درود شریف کا ورد کرتا آنکھوں میں روشنی کی طرح اپنے نجات و ہندہ کا نام بسائے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ چاند دھیرے دھیرے بدلیوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ اس کی ترسی ہوئی آنکھوں میں بھی مدینہ کی حسرتیں جھلملا رہی تھیں جیسے اس کا دل چاہ رہا ہو وہ بھی ایک اونٹ کی مہار تھامے اور عازم مدینہ ہو جائے اک اونٹ کی پشت پر رعدی سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی آنکھوں میں دیار حبیب کی جوت جگائے دل میں پہنچنے کی تڑپ لئے مگر دل کے کسی گوشے میں ہلکا ہلکا خوف کروٹیں لے رہا تھا۔ تقدیر کی ظالم گھاتوں سے سہما ہوا دل سوچ رہا تھا کہ کہیں محبتوں' جذبوں کے اس سفر کو نظر نہ لگ جائے کہیں مجھ بدنصیب کی وجہ سے یہ کارواں منزل سے دور نہ ہو جائے کہیں آسانیاں مشکلوں میں نہ بدل جائیں ایسے میں کسی نے مترنم آواز میں درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔ پھر تو آوازوں کا سلسلہ بندھ گیا چاندنی مزید نکھرتی گئی۔ اور اونٹوں کی چال میں عجیب دلکشی آگئی درود شریف کا وِرد روح کے سوئے تار جگاتا گیا۔ سارے خدشات جیسے ریت کا ڈھیر بن گئے رعدی مصر کی ایک مشہور و معروف مغنیہ تھی اس کے بہت سے چاہنے والوں میں ایک مسلمان بھی تھا جو کہ ایک امیر کا بیٹا تھا رعدی عیسائی ماں کی بیٹی تھی مگر اپنے مذہب سے بالکل بے بہرہ تھی۔ اسے مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا—— اگرچہ وہ ایک رقاصہ و مغنیہ تھی—— مگر گناہ و عذاب کی اس زندگی سے تنگ آئی ہوئی تھی اور کسی ایسے مضبوط سہارے کی متلاشی تھی جو اسے اس رنگین و سنگین دنیا سے نکال کر پاکیزہ دنیا کی طرف لے جاسکے۔ اس آرزو کی تکمیل کے لیے اس نے اپنے مسلمان چاہنے والے کو آزمانے کا قصد کیا۔ ایک دن تنہائی ملنے پر اس نے اپنے چاہنے والے کو حال دل کہہ سنایا وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھا تھا اس نے فوراً اسے اپنانے کی حامی بھرلی مگر ایک شرط کے ساتھ رعدی پہلے مسلمان ہو جائے' اس کی شرط سن کر رعدی مسکرائی یا امیر۔ اسی مقصد کے لیے ہی تو میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے ورنہ مجھے اپنانے والے کیا کم تھے۔ میرے دل میں اسلام کی شمع کب سے چپکے چپکے سلگ رہی تھی۔ مگر میرے آس پاس بہت اندھیرا تھا۔ ان اندھیروں میں آپ کا انتخاب مجھے روشنی محسوس ہوا تو میں نے یہ فیصلہ کیا میں اپنے تن کی گندگی پر شرمندہ ہوں مگر میری روح میری تن کی

ساتھی نہیں تھی اور اس روح کی تسکین کے لیے یہ راہ اپنانے کا سوچا ہے میں نے۔ اس امیر زادے اور رعدی نے چھپ کر نکاح کر لیا۔ نکاح کے بعد رعدی فوراً ہی حج کے لیے جانا چاہتی تھی ارض حجاز کا قصد اس کی اسلامی زندگی کا روشن خواب تھا۔ جس کی تعبیر پانے کے لیے اس نے کوششیں شروع کر دیں۔ امیر زادہ اپنے مقصد حیات کی تکمیل کے لیے جستجو میں لگ گیا وہ ہر روز شہر میں آنے والے کاروانوں کا پتہ کرتا کہ جیسے ہی کوئی کارواں ارض حجاز کو جانے والا ملے وہ اس میں شامل ہو جائیں۔ ہر روز کی جستجو اور دنوں کی تلاش رنگ لائی اور ایک قافلہ انہیں مل گیا۔ ارض حجاز کو جانے والا اس اثنا میں رعدی بدستور اپنے پہلے گھر مقیم رہی کہ مبادا اس کے نکاح اور مسلمان ہونے کا راز کھل نہ جائے اور عیسائی اس کے شوہر کی جان کے دشمن نہ بن جائیں۔ قافلے کی خبر ملتے ہی رات کے اندھیرے میں دنیا والوں سے چھپ کر رعدی اپنے شوہر کے ساتھ کارواں تک پہنچ گئی۔

کارواں صبح تڑکے ہی روانہ ہو گیا چلے قافلے حجاز کے' چلے قافلے حجاز کے. یہ بول گنگناتی رعدی' خواہشوں تمناؤں کے اس سفر پر روانہ ہو گئی جو اس کی روح کی پہچان تھا۔ کارواں چلتا رہا۔ منزلیں طے ہوتی رہیں فاصلے سمٹتے رہے رعدی راستے میں چلنے والی ہواؤں سے سرگوشیاں کرتی' چلے قافلے حجاز کے "آسمانوں پر ٹمٹمانے والے ستاروں کو نوید سناتی' چلے قافلے حجاز کے" وہ اپنے آپ سے ماحول سے بے خبر سی ہو کر حجاز مقدس کو دھڑکنوں میں بسائے شوق کے سفر کی مسافتیں طے کر رہی تھی۔ منزل سے بہت نزدیک ارض حجاز کی سرحدوں کے قریب اس رات قافلے کا پڑاؤ ہوا۔ رعدی منزل کے قریب آنے کی نوید اپنے شوہر سے سن چکی تھی چلے قافلے حجاز کے' مگر شاید تقدیر کو اس کی وہ انمول خوشی نہ بھائی۔ رات کے اندھیرے میں قافلے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ صحرائی ڈاکو اس قدر اچانک حملہ آور ہوئے کہ قافلے والوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پل کے پل میں سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا۔ رعدی نے اپنے محبوب شوہر کو اپنی انکھوں کے سامنے کٹ کر زمین پر گرتے دیکھا اس نے اپنے سارے خوابوں کو خون کی صورت خاک میں نیلام ہوتے دیکھا۔ آرزوئیں' شوق' حسرتیں سینے کے قبرستان میں دفن ہو گئیں۔ روح سسکتی بلکتی بدن کی اندھیر نگری میں

مقید ہو گئی اور رعدی بدنصیب بدبخت رعدی روح و دل کے اس سفر میں سب کچھ ہار کے حجاز کے راستوں میں لٹ گئی۔ تشنگی کا حسرتوں کا کارواں اپنی موت آپ مر گیا۔ جانے کیوں یہ واقعہ مجھے یاد رہ گیا اور میں نے کاغذوں پر رقم کر دیا۔ شاید اس کے پس منظر میں روح کی تشنگی کا احساس شامل ہے۔ ایک جوگن تھی مدینے کی برہا کی ماری، جوگن قریہ قریہ شہر شہر، ملک ملک پھرتی اپنے من کی نگری کا دیپ جلائے جذبوں کی پونجی پلو سے باندھے حسرتوں کا ساگر نینوں میں چھلکائے امیدوں کے کشکول ہاتھ میں پکڑے ماری ماری پھر رہی تھی۔ مدینے کی کھوج میں دکھوں کے دشت کی صحرا نوردی اس کا چلن بن چکی تھی، نا امیدی کی دھوپ تن بدن جلائے دیتی تھی۔ مشکلوں کی آندھیاں من کے دیئے بجھانے پر آمادہ نظر آتی تھیں، مگر آس کا ستارا راہوں کی بھول بھلیوں میں چمکتا منزلوں کی نشاندہی کرتا رہتا تھا۔ اور وہ برہا کی ماری پریت کے بندھن میں بندھی زخمی زخمی پاؤں، ٹوٹے پھوٹے جسم اور چھالے چھالے زبان کے ساتھ مجسم جستجوئے در محبوب تھی۔ پھر قسمت کی مہربانیوں کا در وا ہوا۔ مقدر کے دامن میں وصل کی خوشبو بکھر گئی اسے ایک کارواں جو طیبہ کی اور جا رہا تھا مل گیا اور وہ دریدہ تن بدن کے ساتھ اس میں شامل ہو گئی۔ کارواں کے پیچھے پیچھے گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ کارواں ٹھہرتا تو وہ بھی ٹھہر جاتی چلتا تو وہ بھی چل دیتی۔ نیند آرام اور بھوک پیاس سب کچھ بھولے ہوئے تھے اس کو، وہ روح کے اس سفر پر نکلی تھی جہاں ایسی سب چیزیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ فاصلے سمٹتے گئے۔ دوریوں کی اذیتیں قربتوں کا لمس پا کر پرسکون ہونے لگیں۔ ایک جھٹکا سا لگا اور آنکھ بے اختیار کھل گئی۔ دوران سفر نجانے کس وقت آنکھ لگی تھی۔ شاید بخار کی غنودگی تھی۔ آنکھ کھلی تو بس رکی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ باجی کونسی جگہ ہے۔ کوئی منزل ہے، باجی نے رات کے اندھیرے میں جھلملاتی بتیاں دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا بخار بڑھ گیا تھا۔ چکراتے ہوئے سر میں طرح طرح کے سودے سما رہے تھے کبھی رعدی کبھی جوگن کبھی کھانسی کبھی دکھن۔ اس وقت دماغ کچھ بکھرا ہوا سا تھا۔ کچھ کھائیں گے آپ لوگ، بھائی قاسم سیٹ سے اٹھ کر قریب آتے ہوئے بولے۔ کچھ لے ہی آئیں۔ باجی ثریا نے کہا۔ بھائی صاحب نیچے اتر گئے۔ قریب ہی ایک پاکستانی ہوٹل تھا۔ جس

میں پاکستانی کھانوں کا بندوبست تھا۔ کھانا آ گیا سب مصروف طعام ہو گئے۔ میرے تپتے بدن اور سرخ چہرے کو دیکھ کر سب فکر مند تھے ــــــ میں ان سب کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کیا ہی اچھا ہو کہ یہ جسم کی مشکلیں ختم ہو جائیں۔ یثرب کی راہیں اور جسم کا آزار کتنی بد نصیبی ہے کہ صدیوں کے انتظار کے بعد چند لمحوں کی قربت مل رہی ہے اور وہ بھی جسم کے آزار کی نذر ہو رہی ہے ــــــ واہ ری قسمت جب تو مہربان ہوئی تو مشکلیں اس صورت میں وارد ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام قافلے والے جمع ہو گئے اور کارواں چل نکلا۔ خدشات کے بگولے ذہن کو اڑاتے پھرتے رہے فاصلے گھٹتے رہے کارواں بڑھتا رہا۔ اونٹوں کے قدم اور بھی رواں ہو گئے مدینے کی چاہتیں' طیبہ کی عقیدتیں اور در حبیب کا دیدار۔ کارواں کا ہر ذی نفس آنکھوں میں منزل کا شوق بسائے اپنے جوش کو ہوش کی تھپکیوں سے سلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تمام عمر کی بے قراریاں سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ اس وقت آنکھیں کتنی محترم کتنی مبارک بن گئیں تھیں۔ آنکھیں جو دنیا میں بہت کچھ دیکھتی ہیں بہت سے اچھے برے واقعات کی شاہد ہوتی ہیں' جب یہ برائی دیکھتی ہیں تو گناہ کے کسی نازک لمحے سے متاثر ہو کر دل کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہیں اور بعض اوقات یہی نازک لمحے بن چاہے بن مانگے انسان کی جھولی میں کچھ یوں آن گرتے ہیں کہ زاہد و عابد متقی و پرہیزگار بھی اپنی تمام عمر کی پونجی کو ہار بیٹھتے ہیں اور انہی آنکھوں کی بدولت اپنا سب کچھ گنوا کر اندھیروں کے راہی بن جاتے ہیں۔ بظاہر چپ چاپ معصوم و بے خبر آنکھیں۔ خاموش بے اختیار آنکھیں مگر حقیقتاً جسم انسانی میں سب سے زیادہ طاقتور شے آنکھیں۔ اس وقت بڑی مبارک بڑی با نصیب بن گئیں تھیں آنکھیں' روشنیوں کا سلسلہ سا بندھ گیا قطار در قطار جگمگاتی روشنیوں کی جھلملاہٹ لمحہ بہ لمحہ قربتوں کی گھڑی کا نزول۔ میں نے جلتے بدن کی پرواہ کئے بغیر کھڑکی کھول دی۔ جسم میں اندر باہر ہر طرف معطر خوشبو پھیل گئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں جسم کی جلتی نگری کو سکون بخش رہی تھیں۔ وقت بھی شاید اس لمحے رک گیا تھا گزر ہی نہ چکتا تھا۔ لمحے پھیلتے جا رہے تھے وہ شاید اس آخری وقت بھی ہمارے صبر کا امتحان لے رہے تھے۔ پھر وقت کو شاید ہم پر ترس آ ہی گیا ہم ملن کی اوس میں بھیگتے چلے گئے بس ایک جھٹکے کے

ساتھ رک گئی۔ مگر بس کے اندر ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ سناٹا تھا۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ جذبوں کے تمام سفیر خاموش تھے۔ ہولے ہولے آہستگی سے اپنا سامان اٹھائے چلے جا رہے تھے عام طور پر جیسا کہ سواری کے رکنے پر شور و غل اور بدنظمی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ہر کوئی دوسروں سے پہلے باہر جانے کے لیے بیتاب ہوتا ہے اور اس جلد بازی میں دھکم پیل کا اک ناپسندیدہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ خلاف معمول ایسا نہ ہوا۔ شاید طیبہ کی فضائیں اتنی باادب و محترم تھی کہ وہاں کسی قسم کی بے ادبی کا احتمال ہی ممکن نہ تھا۔ بس سے اترتے ہی نظروں کی رسائی میں روشنیوں و نور میں گھری مسجد نبوی جلوہ افروز تھی۔ سبز گنبد اپنی ابدیت سمیت اپنی عظمت سمیت نظروں کے سامنے تھا۔ ہر طرف خاموشی، با ادب نظریں، پانی پانی جسم، کانپتا لرزتا دل، بے حس و حرکت وجود یہ زندگی کا کیسا روپ تھا جو زندگی ہی سے بے خبر کر گیا تھا۔ ہر طرف نور کا سیلاب تھا۔ روشنیوں کا اک جہاں تھا۔ میں کن روشنیوں اور نور کے مرکز پر پہنچ کر ٹھہر گئی تھی کہ دنیا کے تمام رنگ ماند پڑ گئے تھے۔ گنبد خضریٰ، نگاہوں میں، دل میں، زمینوں، آسمانوں میں، روح میں بدن میں، احساس میں، دھڑکنوں میں، خیالوں اور سوچوں میں، تقدیر میں، تدبیر میں، آس میں، امید میں، ہر طرف، ہر سمت، ہر جگہ ایک ہی جلوہ ایک ہی منزل ایک ہی رنگ تمام رنگوں میں ڈھل گیا تھا۔ میں چکراتے سر کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ شاید اس وقت تقدیریں بھی اپنی سربلندی پر نازاں تھیں۔ دل آنکھوں کو چپکے سے کہہ رہا تھا۔ بہت بھٹک لیا۔ بہت خوار ہو لیا۔ اب اور سکت نہیں اور ہمت نہیں ہے۔ سنبھال لو۔ حفاظت سے احتیاط سے جلوؤں کے ان نازک آبگینوں کو یہ بہت انمول ہیں جان کے مول بھی سستے ہیں۔ بس ہمیں چھوڑ کر کب کی جا چکی تھی ہم سب اپنے اپنے جذبوں کی نیا میں تیرتے ہلکورے لیتے سکھ کے کس ساگر میں اتر گئے تھے کہ خبر نہ ہوئی کتنا وقت گزر گیا۔ ہماری خود فراموشی کے سحر کو پاس سے گزرنے والے حجاج کے گروپ نے توڑا۔ جو زور زور سے بولتے ہوئے قریب سے گزرا انہیں دیکھ کر ہمیں بھی احساس ہوا کہ چلنا چاہیے اور اپنے سامان کو سنبھالتے ہم چل دیئے قریب ہی بیت الخلاء تھے سب پہلے وضو سے فارغ ہوئے اور پھر ہم مسجد نبوی کے سامنے جا پہنچے۔ مسجد نبوی چونکہ رات

کو بند ہو جاتی ہے اور تہجد کے وقت کھلتی ہے اس وجہ سے تمام دروازوں کے سامنے بہت ہجوم تھا۔ ہر کوئی اندر جگہ پانے کا خواہشمند تھا۔ ہر کوئی دربار عالی سے فیض یاب ہونے کا آرزو مند۔ وہ اپنی اپنی چاہتوں کے مارے چاہتوں کے درد کے مداوے کے لیے وہاں جمع تھے اپنی اپنی روحوں کی اداسی لیے جنموں کی پیاس لیے قرنوں کی تھکن لیے حاضر تھے، اپنے سارے بوجھ سارے الم لیے وصل کے امیدوار۔ فیض کے طلبگار اور اسی طلب کی آرزو میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس سلسلے میں ہر کوئی دروازے کے بالکل سامنے پہنچنے کی فکر میں تھا، دروازے جو بند تھے۔ دروازے جو تقدیر کی کنجی تھے۔ دروازے جو اپنے اندر شوق کا جہاں بسائے ہوئے تھے۔ حیلے کیے قریب جانے کے لیے مگر قربت نہ مل سکی سب باب بند ان کے آگے جذبوں کی مضبوط دیواریں اور ان دیواروں کی سختی نے ہمیں اور پگھلا دیا۔ دیوانہ وار سب در آزمائے۔ اور بالآخر ناکام ہو کر باب النساء کے سامنے زمین پر بیٹھ گئے کچھ دیر گزری تو سامنے دروازے کے آگے جمع ہجوم میں اک بے چینی سی پائی۔ لوگ ایک دوسرے پر گرے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے کندھوں پر لٹک کے راستہ بنانے کا حیلہ کرتے ہوئے دروازہ کھلا۔ ہولے ہولے دروازے کے دونوں پٹ پکڑے درباں دروازہ کھول رہے تھے۔ بے تاب خلقت، ادھ کھلے دروازے میں ایک دوسرے کو لتاڑتی پیستی، دھکے دیتی، اندر گھسنے کی کوشش میں مصروف تھی ان کی اس حرکت کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے دربانوں نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی اندر جانے والے اندر رہ گئے باہر والے باہر کھڑے رہ گئے اور تقدیر کا در بند ہو گیا پھر عربی میں ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سمجھ تو نہ سکی۔ مگر اندازے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ انہیں نظم و ضبط سے اندر جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ یہ مانا نظم و ضبط زندگی کے ہر شعبے کی اہم ضرورت ہے۔ مگر بعض ضرورتیں زندگی اور اس کے تقاضوں سے اونچا بہت آگے لے جاتی ہیں جہاں پہنچ کر انسان کو زندگی اور اس کی ضرورتیں بہت چھوٹی بہت غیر اہم لگنے لگتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ تاثر اس مجمع میں اس وقت پایا جاتا تھا۔ کسی طرح سے انہیں سمجھا بجھا کر دروازہ پھر کھولا گیا۔ اس اثنا میں ہم لوگ بھی دروازے کے قریب جا پہنچے تھے اور موقع پا کر اس بھیڑ

میں گھس آئے تھے جو دروازے کے آگے جمع تھی ہم سب نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ دروازہ کھلا ایک جھٹکا سا لگا اور ہم اس سمندر کی لہروں میں موج در موج بہتے بغیر کسی کوشش کے ساحل تک پہنچ گئے اللہ کی کن کن مہربانیوں کا ذکر کیا جائے' اس سفر مبارک میں تو قدم قدم اس کی رحمتوں کی بے پناہ مظاہرے دیکھے۔ اس نے لمحہ بہ لمحہ ہمیں نوازا۔ ہمیں سرفرازا۔ میرے درد و کرب کا مداوا تو وہ دوار تھا جہاں میں آبلہ پا کھڑی تھی۔ زخم زخم جسم لیے تمام تر چاہتوں اور شرمساریوں سمیت کھڑی تھی۔ جہان کے جلتے دوزخ سے دکھوں کی جلن لیے بے سرو سامان کھڑی تھی۔ میرے پالن ہار کو خبر کر دو کہ دکھیاری آن پہنچی کیسے بتاؤں کہ لمحوں کی دھوپ چھایا میں کیا کیا کچھ ہار کر پہنچی ہوں جانے کتنی صدیوں کی پیاس نے زبان پر کانٹوں کا جنگل سا اگا دیا ہے' زخمی زخمی زبان ہل بھی نہیں سکتی۔ مختلف رنگ برنگی آوازوں کے شور نے مجھے بے دم کر دیا میں کھڑی کھڑی نیچے گر گئی بخار کی شدت سے' اور وہیں بیٹھے بیٹھے بے خبر ہو گئی۔ "الصلوٰۃ خیر من النوم" اس صدا پر لبیک کا عمل نجانے کیسے ادا ہو گیا۔ مگر اس کے بعد وہاں بیٹھا نہ گیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہاں جا رہی ہو خالہ نے پوچھا۔ باہر' ڈگمگاتے قدموں سے باہر کو چل دی ستونوں کا سہارا لیتی لڑکھڑاتے جسم کے ساتھ چل رہی تھی۔ نظریں دھندلاتی جا رہی تھیں۔ سانسوں کی تپش سینے کو جلائے دے رہی تھی کیا کیا سوچا تھا۔ ملن کے کیسے کیسے تصورات باندھے تھے کتنے اہتمام چاہے تھے' وہ آرزو جو برسوں پر پھیلی ہوئی تھی اس کی تکمیل پر چراغاں کرنے کو کیسے کیسے خواب بنے تھے۔ مگر آہ محرومیاں۔ راہ کی دیوار بن گئیں کچھ بھی نہ ہو سکا۔ حاضری کی تمام رسمیں کہیں بچھڑ کر رہ گئیں اور بچ گئے گھسٹتے ٹوٹتے قدموں کے خرابے جسم کی مجبوریاں روح کی تشنگی کو بھڑکا رہی تھیں اور گھائل روح تڑپ رہی تھی۔ باہر نکل کر قریب ہی رکھے اپنے سامان تک پہنچ کر ہمت جواب دے گئی میں نیچے ڈھے گئی زمین پر بچھی چھوٹی چھوٹی کنکریاں چبھ رہی تھیں۔ مٹی سے پاکیزہ سی خوشبو آ رہی تھی وہ مٹی جو میرے حبیب کے قدموں سے مس ہوئی کتنی محترم و مقبول تھی۔ میں نے اپنا منہ اس مہربان مٹی کی آغوش میں چھپا لیا اس عالم میں پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ آس پاس عجیب طرح کا شور بہت سی آوازیں سماعتوں کو بیدار کر رہی تھیں

مختلف بولیوں اور قدموں کی چاپ ذہن کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ ہوش و بے ہوشی کی درمیانی سی کیفیت تھی۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی تو وہ جیسے پھٹنے لگتیں۔ سر پتھر کی طرح سے بھاری تھا۔ گلے میں زخم جاگ اٹھے تھے جسم جلتی آگ کا الاؤ بن گیا تھا۔ پیاس شدید پیاس۔ پانی پانی، میری روح نے پیاس کا واویلا مچایا تھا کہ لبوں نے سمجھ نہ سکی شاید اس لمحہ روح و جسم کی تمام پیاس اکٹھی ہو کر لبوں پر جمع ہو گئی تھی۔ ہر طرف پیاس ہی پیاس اندر باہر جسم میں، روح میں۔ اس پیاس نے مجھے نیم جان کر دیا اس وقت ہمت طاقت کچھ بھی پاس نہ رہا تھا۔ میں جسم کے آزار سے نپٹنے کے لیے یک و تنہا رہ گئی تھی۔ سارے ساتھی بچھڑ گئے تھے۔ پانی میرا تپتا جسم پوری طاقت سے چلا اٹھا۔ پانی پی لو بیٹا خالہ عزیز کی مانوس سی آواز بہت دور سے سنائی دی، میرے پیاسے لب کھلے پانی کا ٹھنڈا ٹھار گلاس میرے ہونٹوں سے ٹکرایا کانپتے ہاتھوں نے اس آب حیات کو تھام لیا ایک ہی سانس میں پورے گلاس کو خالی کر ڈالا۔ خشک لب سیراب ہو چکے تھے پانی کی آرزو مٹ چکی تھی مگر روح کے خشک ہونٹوں پر مرونی چھا رہی تھی۔ لبوں پر بار بار زبان پھیرتے وہ گنبد خضریٰ کو ترسی ہوئی نگاہوں سے تک رہی تھی۔ ڈبڈباتی آنکھیں چھلکنے کو تیار تھیں۔ خشک ہونٹ پھٹنے کے قریب تھے پیاس پیاس، صحرا صحرا ہر طرف جلن تپش۔ میں کیا کروں میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں سر پٹختی پیاسی روح سے شرمندہ تھی، اور اس کی پر امید چھلکتی آنکھوں سے نظریں چرائے ہوئے تھی۔ تن کو سیراب کر لیا اور میں رہی پیاسی اب وہ باقاعدہ گلے شکوے کر رہی تھی۔ کیا پانی نہ پیتی تو مرجاتی اس نے طنز کیا، ہاں مرجاتی، میں تقریباً رو پڑی مرجاتی تو کیا فرق پڑ جاتا اس مشکل سے نجات تو مل جاتی جو اب مجھے لاحق ہے۔ روح اس سے بڑی ظالم ہو گئی تھی۔ میں سہم گئی ہولے ہولے آنکھیں کھولیں تو خالہ عزیز کو پاس پایا۔ کیا بات ہے بشریٰ، انہوں نے پوچھا کچھ نہیں، آپ بتائیں وہ سب کہاں ہیں۔ میں نے اپنے آس پاس اپنے کسی بھی ساتھی کو نہ پا کر استفسار کیا۔ وہ سب تو روضہ رسول کی زیارت کو گئے ہیں کیونکہ زیارت صبح آٹھ سے گیارہ اور شام کو تین بجے سے پانچ بجے تک ہوتی ہے اس لیے سارے ابھی گئے ہیں کہ پھر زیادہ رش نہ ہو جائے۔ آپ کو کس نے بتایا ہے۔ زیارت انہی اوقات میں

ہوتی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق تھا زیارت روضہ اقدس تمام دن میں ہو سکتی تھی۔ خالہ عزیز سے نئے اوقات کا سن کر حیرت سی ہوئی۔ مجھے ان سب لوگوں سے معلوم ہوا جو کچھ دن پہلے کے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ خالہ عزیز کی معلومات حاصل کرنے والی خصوصیت سے میں واقف تھی کیونکہ کافی حد تک ان کی معلومات ٹھیک ہوتی تھیں۔ آپ کر آئیں زیارت ہاں میں تو ابھی کر کے آ رہی ہوں۔ انہوں نے فخر سے جواب دیا۔ تم شاید نہ جا سکو' کیوں میں تڑپ اٹھی۔ اس لیے ایک تو وہاں رش بہت زیادہ ہے اور دوسرا تمہیں بخار بھی بہت تیز ہے تمہارا وہاں نہ جانا بہتر ہے۔ وہ لفظ میرے تپتے جسم پر انگاروں کی طرح برس پڑے میں جل اٹھی۔ خالہ عزیز مجھے ذرا اٹھائیں۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا۔ کس طرف کو گئی تھیں زیارت کے لیے' بخار کی تپش اور سحری کے اندھیرے میں مجھے سمت کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ سامنے باب النساء سے عورتیں اندر جاتی ہیں۔ وہیں سے اندر جانا ہوتا ہے مگر تم نہ جاؤ انہوں نے اصرار کیا۔ لیکن میں اس سے پہلے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مٹی سے اٹا ہوا جسم' گرد گرد چہرہ' آگ اگلتی سانسیں اور درد کی لہریں۔ میں لڑکھڑاتے ڈولتے قدموں سے خود کو گھسیٹے آگے بڑھ رہی تھی دور ہی سے میری دھندلائی ہوئی نگاہوں نے اس سمندر کو دیکھ لیا تھا۔ جو باب جبریل اور باب النساء کے آگے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مرد وزن کی کوئی تفریق نہ تھی۔ سب اپنے اپنے فراق کے مارے ملن کے لمحوں کو نزدیک تر لانے کی کوششوں میں مگن تھے میں جو بڑی ہمت اور جذبے سے وہاں پہنچی تھی۔ اس موج در موج لہراتے بکھرتے پھیلتے سمندر کو دیکھ کر سہم گئی مرد بھی مشکلوں سے اندر جا رہے تھے۔ بھلا ان کے آگے میری کیا پیش چلے گی۔ اب کیا ہوگا۔ میں لب دریا تشنگی کے عذاب سے دو چار تھی۔ دھیرے دھیرے چلتی خود کو سنبھالتی آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر ہجوم کے قریب پہنچ کر قدم رک گئے۔ گمان کے پھولوں بھرے راستوں پر چلتے چلتے حقیقتوں کے امتحان درپیش ہوئے تو جان کی کمزوری نے آن گھیرا۔ میں چپ چاپ وہاں شاید کسی معجزے کی آس میں کھڑی تھی کہ اچانک ایک ادھیڑ عمر آدمی عبا میں ملبوس سر پر سفید عمامہ ہاتھ میں تسبیح چہرے پر سیاہ و سفید ملی جلی داڑھی میرے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ حج زیارت یہ دو لفظ میرے پلے پڑے۔ میری آنکھیں چھلک

پڑیں۔ لفظ خاموش ہو گئے۔ مگر سرہاں میں ہل گیا آؤ' وہ تھا تو عربی مگر اردو سے شاید واقف تھا۔ اس لمحے میں نے اللہ اور اس کے حبیب کی بھیجی ہوئی غیبی امداد کو تھام لیا جو اس لمحے میرے لیے خضر راہ تھی وہ سمندر کی بھپرتی' مچلتی لہروں کی تندی کو اپنے بازوؤں سے کاٹتا مجھے گھسیٹتا اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر وہ میرے آگے لگ گیا۔ میں نے اس کے کندھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس اللہ کے بندے نے مجھے قدم قدم اس بے بہا بھیڑ سے اس طرح نکالا جیسے کوئی مشکل ہی نہ ہو۔ ہم بڑھتے رہے۔ ریاض الجنتہ۔ اس نے مجھے زمین کے اس ٹکڑے کے بارے میں بتایا جسے جنت کے باغوں کی کیاری کہا جاتا ہے۔ ج نفل دو لفظ کتنے چھوٹے کتنے با معنی۔ اشارے سے اس نے مجھے نفل پڑھنے کے لیے جگہ بتائی۔ نہیں میرا ڈولتا سر ہل گیا۔ پتہ نہیں اس لمحے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ نفل پڑھنے کو قطعاً دل نہ کر رہا تھا۔ اک آگ تھی۔ درد کی شدت تھی ملن کی تڑپ تھی' محبوب کے قریب پہنچ کر اس سے لمحہ بھر کی دوری بھی گراں گزر رہی تھی۔ میری ہمت ٹوٹ رہی تھی' اندر سے کوئی آواز مجھے بار بار تنبیہہ کر رہی تھی۔ رکنا مت' ٹھہرنا مت ٹھہرو گی تو منزل کو کبھی نہ پا سکو گی۔ ان لمحوں کے جھومر کو اپنے نصیبوں کے ماتھے پر سجا لو ہمیشہ کے لیے اگر یہ ہاتھ سے نکل گئے تو تمام عمر ترستی رہ جاؤ گی اور خدا گواہ ہے میرا دل اس وقت ریاض الجنتہ میں نوافل ادا کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ ریاض الجنتہ میں نوافل ادا کرنا جیسا کہ ارشاد نبی ہے یوں ہے جیسے جنت میں نوافل پڑھنا اور جس نے وہاں نفل پڑھ لیے وہ جنت کا مستحق ہو گیا ان سب ارشادات سے با خبر تھی میں۔ مگر اس جنت یا اس کا تصور بھی میرے پاس کہیں نہ تھا۔ کیونکہ ساری بات تو نسبت کی ہے۔ کسی کو جنت سے نسبت ہے اور کوئی جنت والے سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے ظرف' اپنے اپنے تعلق کی بات ہے' اس وقت وہ جنت جو بعد از مرگ ملنے والی شے ہے فضول لگ رہی تھی میرے روگ شاید آسمانی جنت کی دوا کے طلبگار نہ تھے۔ وہ تو اس حقیقی جنت کے متلاشی تھے جو روضے کی جالیوں میں پوشیدہ تھی۔ جو زمین پر محمد مصطفیٰؐ کے نام کی صورت میرے پاس تھی میں اتنی نزدیکی و حقیقی جنت کو چھوڑ کر بعد از مرگ ملنے والی جنت کی تمنا کیسے کرتی۔ مجھ پر اس لمحے قربتوں کی راہوں میں ملنے والی دوریوں کا ایک

پل بھی گراں گزر رہا تھا۔ میری جنت اور میرے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا‘ کہ درمیان میں اچانک رکاوٹوں کی ایک دیوار آن کھڑی ہوئی۔ ہمارے سامنے رکاوٹوں کی دیوار بنا روضہ اقدس کا دربان کھڑا تھا اور ہمیں واپس جانے کا کہہ رہا تھا اس کے جواب میں میرا راہنما بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر وہ مسلسل انکار کر رہا تھا اور میرا راہنما اصرار‘ ان کی اس تکرار کے درمیان میرا حال اس خطا کار کا سا تھا جو نہ بازیگری کی مقدرت رکھتا ہو نہ ساحری کی۔ بے عذر بے زبان خطا کار اپنے عشق کا مارا اپنے درد کا جلا۔ اپنی بد نصیبی پر مجھے خود ہی ترس آ رہا تھا۔ جس جنت حقیقی کے لیے آسمانی جنت ٹھکرائی وہی ہنوز دور تھی۔ اپنا تو وہی حال تھا کہ نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔ کیا کروں عجب بے بسی کا عالم تھا۔ میں سر جھکائے گردن ڈالے کھڑی تھی کہ میرے راہبر نے اس روکنے والے کا ہاتھ جھٹک کر پرے کیا۔ اور مجھے لے کے آگے بڑھ گیا۔ میں لرزتی کانپتی اندر داخل ہو گئی اندر پہنچ کر میرے قدم جیسے جام ہو گئے‘ میرا راہبر مجھے آگے لے جانے کی کوشش کرتا اور میں رکنے کی سعی کرتی وہ جگہ وہ مقام جہاں میرا غلط کار وجود آ کر ٹھہر گیا تھا۔ میری امید میرے ظرف کے جہانوں سے بڑھ کر تھا۔ میں جسے چراغ زیست لیے کھوجتی رہی پل پل وہ سورج لمحہ میری دسترس میں تھا۔ میں اپنے بے قرار ہاتھوں سے اپنے سوختہ تن کو ٹٹول ٹٹول کر خود کو یقین دلانے کی سعی کر رہی تھی کہ میں عالم خواب میں نہیں عالم حقیقت میں ہوں قریہ جان میں وصل کی بہار مسکا رہی تھی‘ میں لمحات وصل میں اپنے موم موم جسم کے ساتھ پگھلتی جا رہی تھی۔ وصل تو آ گیا۔ بہاروں کا میلہ تو چھا گیا مگر تن کی نگری میں سکتہ کیوں طاری ہو گیا۔ لب گونگے کیوں ہو گئے قدم بھاری کیوں ہو گئے چلنے کی ہمت کیوں ٹوٹ گئی‘ میری خاموشی اور ٹھہراؤ نے میرے راہبر کو پریشان کر ڈالا حج زیارت چلو۔ تنگ آ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر چلانے کی کوشش کی میں گھسٹ پڑی۔ اسلام علیکم یا رسول عربی یا محمد رسول اللہ اس کے لہجے کے سوز میں شاید میرے آنسوؤں کی نمی بھی شامل ہو گئی تھی گھٹتی چیخوں کو دباتی۔ ملن کی شدتوں سے نبرد آزما ہوتی میں ٹوٹ رہی تھی اپنے مسیحا کے پاس پہنچ کر گزرے ہوئے شب و روز کے صدمات اپنے دریدہ تن کے ساتھ جاگ اٹھے تھے تار تار دامن ہستی جہاں کی ستم آرائیوں کے درد لیے حاضر تھا۔ ناامیدیوں

کی داستانیں، ہجر کے فسانے الم کی رود دادیں۔ پل پل ہارنے کے قصے۔ پل پل جینے اور مرنے کی واردتیں لب گونگے تھے۔ مگر جسم کا ہر ہر عضو وقت کی بے وفائیوں کی گواہی دے رہا تھا۔ وقت جو عمر بھر آنکھ مچولی کھیلنے کے بعد آخر ہار گیا تھا۔ مگر اس کی ہارنے وجود کے اندر بہت سے زخموں کے پھول کھلا دیئے تھے اور مسیحا کے سامنے پہنچ کر وہ سارے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ سرخ سرخ خون دل کی لالی سے رنگے ہوئے پھول۔ محبوب کے وصل کی جوت سے مسکرا رہے تھے۔ وصل جو ہجر کی کالی راتوں اور پھیکے دنوں کے بعد نصیب ہوا تھا وصل جس کی امید زندگی کی علامت تھی وصل جس کی آس پر لمحوں کے عذاب کٹے تھے۔ وصل جو تمنائے زیست بن گیا تھا۔ وہی وصل انعام وصل تن من نے پا لیا تھا۔ مگر وہ سارے ستم سارے عذاب اس لمحے بول رہے تھے در محبوب پر پہنچ کر ساری ہمتیں ٹوٹ گئیں تھیں۔ اب اور طاقت نہیں ہے مجھ میں۔ میرے محبوب اب اور جدائیاں سہنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں مجھے پناہ چاہیے، مجھے امان چاہیے۔ ہر طرف خاموشی، ہر طرف سکوت طاری تھا۔ آقا کا دربار عالی تھا۔ فریادن فریاد پیش کر رہی تھی دنیا کی جلتی دوزخ کے چھالے دکھا رہی تھی۔ روح کے زخم دکھا رہی تھی اپنے ہی پانیوں میں غرق ہو رہی تھی مجھے کچھ نہیں چاہیے اے مالک کون و مکان فقط آپ کے در کی غلامی چاہیے فقط آپ کے یثرب کی خاک چاہیے مہر کی نظر چاہیے فقط آپ کے در کی گدائی چاہیے۔ مجھے ہجر کے اندھیرے نہیں چاہیں۔ مجھے وصل کے سویرے بخش دیجئے فقط کرم کی نظر چاہیے آج اس ٹوٹے پھوٹے تن کے ساتھ حاضر ہوں۔ مجھے پناہ دیجئے گونگے لبوں پر حرف تمنا تو خیر کیا ہوتے وہاں تو ہجر کے چھالوں کی دنیا آباد تھی جنہیں وصل کا مرہم سکون سے آشنا کر رہا تھا جدائیوں کی خراشیں ملن کی شفا سے مٹنے لگی تھی۔ خوش ہو اے دل کہ اندھیروں کی روا چاک ہوئی۔ خوش ہو اے دل کہ ملن کی راہ استوار ہوئی دامن دل جو فراق کے صدمات سے پھٹنے کو تھا اسے نوید ہو کہ وصل نے اسے سرفراز دیا۔ جھکی جھکی نظریں اٹھنے کی ہمت نہیں پاتی تھیں۔ سر در محبوب کو سلامی دے رہا تھا۔ وجود خود سے آشنا ہو چکا تھا۔ نجانے وہ کیا کیفیت تھی کہ اب تک اسے بیان کرنے کے لیے لفظ نہیں مل سکے لفظوں کی دنیا میں جیسے کال پڑ گیا ہو۔ پھر سوچتی ہوں کہ الفاظ کی قسمت میں اتنی

رسائی کہاں کہ وہ اس کیفیت تک پہنچ سکیں۔ وہ کیفیت جو شاید اظہار کا روپ دھار ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ صرف اور صرف محسوس کرنے کی کیفیت۔ وہ ماضی و حال اور مستقبل کے زمانوں سے ہٹ کر لافانی زمانوں میں کھو جانے والی کیفیت۔ اس کیفیت کا کوئی نام نہیں کوئی پہچان نہیں مگر وہ زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے اس کیفیت نے یوں جکڑا کہ میں آس پاس سے قطعی بے خبر ہو گئی۔ وصل کے رنگین لمحوں میں یوں رنگی کہ زیست کے تمام رنگ پھیکے پڑ گئے۔ زندگی زندگی سے یوں گلے ملی کہ تمام جسم و روح کی تھکن مٹنے لگی تن کے سب آلام فنا ہونے لگے۔ کہیں کوئی دکھ باقی نہ رہ گیا زندگی سے تمام بے درد لمحے رخصت ہو گئے۔ خوشیوں کے ننھے منھے سے جگنو دکھوں کے گھور میں ٹمٹمانے لگے۔ اجالوں کی بارات اتر آئی تن من میں۔ حج کسی نے مجھے پکارا میں نے جھکی ہوئی آنکھیں اٹھائیں۔ میرا راہبر مجھے چلنے کو کہہ رہا تھا۔ زیارت سیدیؓ ابا بکر صدیقؓ۔ میں سحر زدہ سی اس کے ساتھ چل دی السلام علیک یا سیدی ابا بکر صدیقؓ اس کے لفظوں کو دہراتی اس کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے اس چھوٹے سے بچے کی طرح چل رہی تھی جو بھیڑ میں گم ہو جانے کے خوف سے ماں کا دامن نہ چھوڑ رہا ہو۔ حج یا سیدی عمر بن الخطابؓ جھکی نظریں مزید جھک گئیں وہ دربار عالی مقام اور اس کی شان معصیتوں کے غبار اور جلوہ آفتاب۔ ذہن سے تاریکیاں چھٹ رہی تھیں۔ جلووں کی سرچ لائٹ نے میرے اندر باہر چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ میں چمک رہی تھی۔ روشنی میں نہا رہی تھی۔ اس بے پناہ روشنی نے آنکھوں میں پانی سا بھر دیا تھا۔ اندھیروں کی عادی نگاہیں بھلا اس چکا چوند سے پہلے کب واقف تھیں اندھوں کی طرح اپنے راہبر کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی۔ حاضری مکمل ہو گئی درود و سلام ادا ہو گئے۔ جسم و جان کے نذرانے پیش کرنے کی جسارت تو خیر کہاں سے آتی مگر جسم و جان کو فنا کر دینے والی خواہشوں کی تندی کچھ اور بڑھ گئی۔ میرا راہنما میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے چوکھٹ محبوب تک لایا۔ حج زیارت ختم۔ جاؤ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے اس غیبی فرشتے کو غور سے دیکھا جو خضر راہ تھا میرے اس طرح دیکھنے سے اک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔ زیارت ختم۔ اس فرشتے کے لئے میرے دل میں احترام و تشکر کے جذبے پیدا ہو رہے

تھے اللہ کے اس معجزے پر چشم بینا حیران تھی۔ میں کیا تھی۔ کیا بن گئی تھی حاضری کے سلسلے میں اپنی معذوری اور امداد غیبی مجھ گناہ گار کو اس نے کدھر لا کر کھڑا کیا تھا کہ میں اپنی ناشکری زبان سے تمام عمر بھی اس کی مہربانیوں کا شکر ادا نہ کر سکتی تھی۔ میں زبان کھولنے کے جتن کر رہی تھی گنگ جذبوں کو گویائی کے لیے تیار کر رہی تھی۔ جب زبان ہلی، آنکھیں اٹھیں تو میرے آس پاس کچھ بھی نہ تھا لوگوں کی بھیڑ بہت کم ہونے کے باوجود مجھے کہیں خضر راہ نظر نہ آیا۔ جو میری ڈولتی ڈگمگاتی نیا کو کنارے پر لگا گیا تھا بہت دیکھا مگر اس کا سراغ نہ پا سکی۔ تشکر کے جذبے اندر ہی اندر گھٹ کے رہ گئے میں جسے اپنے ہی جیسا انسان سمجھ بیٹھی تھی شاید وہ واقعی ہی کوئی فرشتہ تھا اس کا ہجوم سے نکل کر میری طرف بڑھنا۔ بطور خاص مجھے مشکلوں سے نکال کر در حبیب تک لے جانا حاضری کی تمام رسمیں ادا کرانا۔ اور پھر اچانک غائب ہو جانا وہ سب کیا تھا اس نفسا نفسی اور مادیت پرستی کے دور میں ایک معجزہ تھا جو اچانک رونما ہوا اور مجھ بیمار ڈولتی لرزتی کو پار لگا گیا۔ وہ معجزہ پالنے والے کی قربت کا احساس مزید گہرا کر گیا۔ میں بہتی آنکھوں سے باہر کو چل دی باہر روضہ رسول کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا۔ وح جو اس سے پہلے بڑی ناآسودہ بڑی غیر مطمئن تھی اس وقت در حبیب کی چوکھٹ بہت سے عذابوں سے نجات پا چکی تھی۔

***

اپنے تن دی خبر نہیں
ساجن دی خبر لیاوے کون

خبر نہیں کتنا وقت بیت گیا آنے جانے والوں کے قدموں کی آہٹیں، بولنے کی آوازیں سماعت کو متاثر کر رہی تھیں۔ بہت دیر بعد سر اٹھایا تو بہت کم لوگ دکھائی دیئے۔ شاید حاضری کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ اٹھی تو سامنے سے امی جان اور باجی کو آتے دیکھا جو شاید میری ہی کھوج میں تھیں انہوں نے میرا سرخ چہرہ اور جلتی آنکھیں دیکھیں تو فکر مند سی ہو کر آگے بڑھیں مجھے چھوا تو گھبرا سی گئیں۔ بیٹے تمہیں تو بہت تیز بخار ہے امی تشویش سے بولیں جی ہاں بخار تو رات سے ہی اتنا ہے تو بتایا کیوں نہیں۔ بتا کر سب کو خواہ مخواہ فکر مند کرتی اور عبادتوں کی مصروفیات میں فکر مندی خلل کا سبب بنتی۔ مگر بیٹے تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔ رات سے مسلسل بے آرامی کر رہی ہو۔ امی اب باقاعدہ فکر مند ہو گئیں۔ رہنے دیں امی۔ اب اس بخار کے لیے میں یہاں کے قیمتی وقت کو ضائع تو نہیں کر سکتی نا۔ چلتا رہے ساتھ ساتھ یہ بخار بھی۔ پتہ نہیں اس وقت ذہنی کیفیت کیسی تھی کہ تکلیف محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی اگر اس طرح مزید لا پرواہی برتی تو چلنے پھرنے سے جاؤ گی۔ ایک آدھ دن آرام کرو دوائی کھاؤ پھر ٹھیک ہو کر سکون سے یہاں آنا۔ گو امی کی بات ٹھیک تھی۔ مگر دل اس وقت ایسی کسی بھی ٹھیک بات کے حق میں نہ تھا اور میں نے اس ضدی کو بے مہار چھوڑ دیا۔ ٹھیک ہے امی جان ضرور آرام کروں گی مگر کہاں میں نے رستے میں پڑے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پہلے آرام کرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ تو میسر ہو پھر آرام کا سوچا جائے۔ میں نے سب کی توجہ اس بڑے مسئلے کی جانب دلائی جو ہنوز تشنہ تھا۔ بھائی قاسم باجی ثریا اور میں پاکستان ہاؤس رہائش کے سلسلے میں گئے

وہاں حج ڈائریکٹوریٹ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت ہی اچھے اخلاق والے تھے انہوں نے ہماری بات توجہ سے سنی۔ اور ہمیں ہماری مرضی کی رہائش مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ان کے آدمی کے ساتھ مسجد نبوی کے قریب ہی ایک بلڈنگ میں پہنچے جو کہ شاید اسی سال ہی مکمل ہوئی تھی اور صرف حجاج کے لیے مخصوص تھی۔ اس بلڈنگ کے آٹھ فلور تھے نہایت جدید اور آرام دہ بلڈنگ تھی۔ لفٹ کے ذریعے آنے جانے کا انتظام تھا ہمیں اس بلڈنگ کے ساتویں فلور میں کمرہ ملا جس میں چھ آدمیوں کا انتظام مکمل تھا۔ ایئرکنڈیشنڈ کمرہ کافی کھلا تھا۔ ساتھ ہی تین عدد صاف ستھرے باتھ رومز تھے جو کہ تقریباً چار پانچ کمروں کے حجاج کے لیے تھے۔ کمرہ دکھا کر وہ آدمی چلا گیا۔ بھائی قاسم کی طبیعت بھی ایک دن پہلے سے خراب تھی وہی فلو ہلکا ہلکا بخار اور کھانسی نجانے کیوں ہم سب کو ایک ہی بیماری نے شکار کر لیا تھا۔ بمشکل کمرے تک پہنچی اور لیٹ گئی رات بھر کی تھکن بخار اور چور چور جسم بستر کو دیکھتے ہی سب مرض جاگ اٹھے۔ بھائی صاحب آپ ہی جا کر امی کو لے آیئے مجھ میں تو اٹھنے کی ہمت نہیں ہے بھائی قاسم جو خود بھی مجھ سے کم تکلیف میں نہ تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہاں تم آرام کرو۔ میں انہیں لے آتا ہوں بھائی چلے گئے میں کمبل لپیٹ کر بے خبر ہو گئی پتہ نہیں کتنی دیر اس بے خبری میں گزر گئی۔ آنکھ کھلی تو باجی کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ کیا بات ہے باجی میں نے اٹھنے کی کوشش کی نماز کا وقت ہو گیا ہے جاؤ گی۔ کیا کر رہی ہو ثریا اسے سونے دو یہ بخار میں کیسے جائے گی۔ امی پریشانی سے بولیں۔ امی جان میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں آپ فکر نہ کریں میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ آپ لوگ کب آئے؟ ہمیں تو دو گھنٹے ہو گئے آئے ہوئے تم سو رہی تھیں اس وقت۔ امی بولیں۔ بیٹی آج کا دن آرام کر لو کل ٹھیک ہو کر مسجد نبوی جانا۔ امی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ یقین کیجئے جب مجھ سے اٹھا نہ گیا تو ظاہر ہے میں کیسے جا سکوں گی۔ آپ کو تو پتہ ہے میری بہادری کا کہ سر میں درد بھی ہو تو برداشت نہیں کر سکتی آپ مطمئن رہیے جب مجھے تکلیف ہوئی۔ تو آپ کے کہے بغیر ہی بستر سنبھال لوں گی بس آپ دعا کیجئے وہ وقت نہ آئے۔ نماز ظہر ہم نے مسجد نبوی میں ادا کی اور نماز کی ادائیگی کے بعد باہر نکلے تو تیز دھوپ اور نمازیوں کے ہجوم نے استقبال کیا۔

مسجد نبوی چونکہ وسعت کے لحاظ سے حرم شریف سے کم ہے اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے وہاں نمازیوں کی سہولت کے سارے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ قالین، پنکھے پانی سب کچھ موجود ہے۔ مگر خلقت کا یہ عالم تھا کہ نہ مسجد میں سما رہی تھی نہ شیڈوں میں، بلکہ نمازیوں کی صفیں مدینہ کے کوچہ و بازار میں بچھی ہوئیں تھیں۔ جہاں وہ شانے سے شانہ ملائے قدم سے قدم ملائے اس کے حضور جھک رہے تھے جو اس عالم کون مکان کا مالک ہے۔ مسجد نبوی سے نکلے تو ہر طرف گلیوں بازاروں میں سر ہی سر نظر آئے جانے اتنی خدائی کیسے وہاں سما گئی تھی کہ دور دور تک کوئی بھی جگہ انسانوں سے خالی نہ تھی۔ اتنی بھیڑ تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر گزرنا پڑتا تھا۔ دھکے پر دھکا پاؤں پر پاؤں۔ ہر کوئی آنے جانے کی دھن میں مگن ہر کوئی جذبوں کی ایک ہی لڑی سے پرویا ہوا۔ ہم ایک دوسرے کو تھامے ہولے ہولے چیونٹی کی رفتار سے گزر رہے تھے وہ پہلا دن تھا طیبہ میں۔ اجنبی اجنبی فضائیں انجانے کوچہ و بازار۔ ان دیکھے رستے نا واقف گلیاں مگر اس اجنبیت میں بھی اک عجیب مٹھاس تھی۔ اپنائیت تھی۔ قربت کا احساس تھا۔ طمانت کا سرور تھا ہم لوگ بڑے مطمئن تھے ان اجنبی فضاؤں میں۔ گو وہ پہلا دن تھا۔ معمولات نئے رہائش گاہ نئی رہن سہن نئے مگر وہاں ہم یوں محسوس کر رہے تھے۔ جیسے جنم جنم کا ساتھ ہو ہمارا جیسے وہ اپنا ہی گھر اپنا ہی آنگن ہو۔ جس میں بلا روک ٹوک بے خوف و خطر رہا کرتے ہیں چلتے چلتے ایک سائن بورڈ پر نظر پڑ گئی۔ میمن ہوٹل بہترین پاکستانی کھانوں کا مرکز لکھا تھا۔ امی پاکستانی ہوٹل ہے اگر کھانا وغیرہ لینا ہو تو چلیں۔ کھانا تو سب نے کھانا ہے کیونکہ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ کھانے کے ذکر پر سب کو یاد آگیا کہ صبح کے بھوکے ہیں۔ پتہ نہیں ہوٹل کا کھانا کیسا ہوا۔ امی کیونکہ شروع ہی سے ہوٹل کے کھانے پسند نہیں کرتیں۔ بے دلی سے بولیں۔ میرے خیال میں ہوٹل کا کھانا اتنا خراب نہ ہوگا اور بالفرض برا بھی ہوا تو پیٹ تو بھرنا ہی ہے۔ میں نے انہیں کنوینس کرتے ہوئے کہا اور پھر یہ بھی تو سوچیں کہ ہم لوگ مدینہ آئے ہوئے ہیں اور مدینہ کی تو خاک بھی ہمارے لئے خاک شفا ہے پھر یہ کترانا کیسا۔ عقیدت کی بات آئے اور میرے قافلے کا کوئی فرد پیچھے رہ جائے یہ ممکن نہ تھا۔ سب یہ سنتے ہی بے دھڑک اندر داخل ہو گئے اندر سادہ مگر صاف ستھرا ماحول

تھا۔ مختلف رنگوں، نسلوں اور عمروں کے لوگ میزوں کے آگے بیٹھے طعام کا لطف اٹھا رہے تھے ہوٹل کے ملازمین بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ ہوٹل کا مالک بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آیا۔ شاید وطن سے باہر ہم وطنوں کی قدر کا احساس دو چند ہو جاتا ہے اور ایسے میں وطن میں ہم وطنوں سے سیدھے منہ بات نہ کرنے والے وطن سے باہر مجسم مٹھاس بن جاتے ہیں۔ ہم کھانا پیک کرا کر باہر نکل آئے کیونکہ بھائی قاسم ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ وہ طبیعت کی خرابی کے باعث کمرے میں ہی رہ گئے تھے اس لیے ہم اکٹھا کھانا کھانے کی غرض سے کھانا پیک کرا کر ساتھ لے آئے تھے۔ کمرے میں آئے تو بھائی قاسم کو لیٹے پایا کیا بات ہے بھائی ان کا سرخ چہرہ آگ اگلتی آنکھیں دیکھ کر تشویش ہو گئی۔ بخار ہو گیا ہے وہ آہستگی سے بولے تھرمامیٹر لگایا۔ نہیں بخار کی شدت نے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ سردی کے ساتھ بخار چڑھا ہے۔ میں جلدی سے تھرمامیٹر لے آئی لگایا تو ۱۰۴ ڈگری ٹمپریچر تھا۔ بھائی آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ بخار تو رات ہی سے ہلکا ہلکا تھا مگر اب شدید ہو گیا وہ بولے تمہارا کیا حال ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ اللہ آپ کو ٹھیک کریں۔ یہ قصہ الگ کہ میں کتنی ٹھیک تھی۔ کھانسی نزلہ بخار نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اپنی تمام ہمتیں جمع کر کے خود کو محرومی کے عذاب سے بچانے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ عصر کی نماز پڑھتے پڑھتے ہی سر چکرا گیا۔ بڑی مشکل سے نماز مکمل کی۔ امی میں جا رہی ہوں۔ کہاں؟ گھر، میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میرے ارادے میری ہمتیں بخار کے آگے دم توڑ رہی تھیں میں جو خود کو لوہا بنانے پر مصر تھی یہ بھول گئی تھی کہ حقیقتاً مٹی کا ایک کمزور بت تھی جو اپنے ناپائیدار وجود پر سرد و گرم کوئی موسم بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اک ذرا سا جھٹکا بھی اس میں دراڑیں ڈال سکتا ہے۔ طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ امی پریشان ہو گئیں کتنی دفعہ کہا تھا آرام کرنے کو مگر ماننا تو تم نے سیکھا ہی نہیں وہ غصے سے بولیں۔ امی آپ ہی بتائیں یہاں آکر آرام کرنے کو دل چاہتا ہے کونسا ہم روز روز یہاں آتے ہیں کہ آج آرام کر لیں ٹھیک ہونے کا انتظار کریں۔ آنسو جیسے پلکوں کی نوک پر رکھے تھے پھسل پڑے پتہ نہیں کیسی قسمت ہے ترس ترس کر آئی ہوں اور آکر بے دست و پا ہو گئی ہوں، حوصلے پست ہو گئے تھے۔ رات کو بخار کی حدت عروج پر تھی امی پاس

بیٹھیں تھیں خالہ مجھے برف کی ٹھنڈی پٹیاں لگا رہی تھیں جسم کے ساتھ ساتھ ذہن بھی جل رہا تھا میرے گناہ میرے عذاب مجسم سامنے آگئے تھے میں ان کی مضبوط گرفت میں تڑپ رہی تھی۔ نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی ـــــ وہ اپنی لال لال زبان نکالے بڑے بڑے نوکیلے دانت نکالے قہقہے لگا رہے تھے میرا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ ہا ہا ہا ہم سے بچو گی تو جاؤ گی نا۔ پہلے ہماری گرفت سے تو آزاد ہو جاؤ پھر جانا در حبیب پر۔ چلی تھی ہم سے منہ موڑ کر آزاد ہونے۔ نہیں نہیں مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں میرا پیچھا چھوڑ دو خدا کے لیے مجھے آزاد کر دو۔ مجھے حاضری کے لیے جانے دو ورنہ میں مرجاؤں گی میرے بندھے ہاتھوں اور التجاؤں کا بھی ان بے رحموں پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ تم آزاد ہو۔ تم آزاد ہو اک ندائے غیب یوں آئی کہ گرفت ڈھیلی پڑ گئی جاؤ کہ وہاں جانے سے تمہیں موت بھی نہیں روک سکتی۔ میں آزاد ہو گئی۔ ہلکی پھلکی ہو گئی آنکھیں کھلیں تو امی اور خالہ بدستور میرے پاس بیٹھی تھیں۔ پانی پانی۔ میرا پسینے میں تر وجود اور لرزتی آواز نے ان کو پریشان کر ڈالا۔ کیا ہوا بیٹے۔ امی جان میرے منہ سے پانی لگاتے ہوئے بولیں اب ٹھیک ہوں امی کچھ نہیں ہوا۔ پانی کے گلاس نے خوف سے جلتے ہوئے جسم کی کھیتی کو سیراب کر دیا تھا۔ تھرمامیٹر لگاؤں۔ نہیں امی جان اب کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں۔ بس اب میں ٹھیک ہوں۔ مگر جسم تو جل رہا ہے ابھی۔ جسم کو جلنے دیں۔ اس کی جلن کا علاج ہو گیا ہے بس آپ فکر نہ کریں۔ امی میری باتوں کو بخار کی شدت کی وجہ سمجھیں مزید فکر مند ہو گئیں۔ پھر غافل ہو گئی۔ الصلوۃ خیر من النوم۔ اذان ہمارے کمرے میں یوں سنائی دیتی تھی جیسے کانوں کے قریب دی گئی ہو۔ اذان کی آواز نے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا دیکھا تو بھائی قاسم بیٹھے تمم کر رہے تھے۔ بخار کی شدت ان کے سرخ چہرے سے عیاں تھی مگر وہ پوری ہمت سے اس فرض کی ادائیگی حسب معمول کر رہے تھے۔ صبح دوائی لینے کی غرض سے ہم قریب ہی ایک ہاسپٹل میں گئے۔ مصری لیڈی ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کیا۔ ڈاکٹر مجھے ایسی دوائی چاہیے جو جلدی اچھا کر دے۔ میں در محبوب پر پہنچ کر فراق کے ایک پل کو بھی برداشت نہیں کر سکتی اس بیماری نے تو مجھے معذور بنا کر رکھ دیا ہے۔ جیسے بھی ہو مجھے جلد ٹھیک ہونا چاہیے۔ تم

پاکستانی ہو؟ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ہاں ڈاکٹر۔ تم پاکستانی اتنے جذباتی کیوں ہوتے ہو۔ کیا مطلب۔ مطلب یہ کہ یہاں آنے والے تمام پاکستانی حجاج کی یہی رٹ ہوتی ہے کہ انہیں جلدی ٹھیک ہونے والی دوا چاہیے۔ کیونکہ وہ سلسلہ جو عبادتوں کا شروع ہے۔ اس میں خلل نہ پڑے تم لوگ حاضری کے بارے میں بہت جذباتی ہو۔ ڈاکٹر نے وضاحت کی۔ ڈاکٹر کے اس غیر متوقع سوال پر میں گڑ بڑا سی گئی۔ ڈاکٹر ہم پاکستانی ضرور ہیں مگر اس سے پہلے مسلمان ہیں۔ ہماری پہچان یہاں مسلمان کی حیثیت سے کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ رہا ہمارے جذباتی ہونے کا سوال تو اس جذباتی پن پر ہمیں فخر ہے۔ یہ جذباتی پن ہماری زندگی کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ زندگی کی وہ حرارت ہے جو ہمیں اپنے موجود ہونے کا احساس دلاتی ہے اگر ہم میں یہ جذباتی پن نہ ہوتا تو شاید ہمیں اپنے ہونے پر افسوس ہوتا ــــ ابھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی' کہ بھائی قاسم آ گئے' چلو بشریٰ دوائی ڈسپنسری سے لینی ہے چلیں' اٹھتے اٹھتے میں نے لیڈی ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو بہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔ ج اس نے عربوں والے انداز میں مجھے میری پہچان سے پکارا تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی انشاء اللہ۔ شکریہ میں وہاں سے نکل آئی اور پھر میں واقعی ٹھیک ہو گئی۔ شام تک بخار بہت کم ہو چکا تھا۔ رات کو بھوک بہت زوروں پر تھی اور بھوک صحت کی علامت تھی۔ میں نے تقریباً تین دن کے بعد خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ رات کچھ سوتے کچھ جاگتے میں کٹ گئی۔ جمعہ کا دن تھا اور یہی پہلا اور آخری جمعہ ہمیں مدینہ شریف میں حاصل ہونا تھا۔ میرے ہمسفر جمعہ کا بڑا اہتمام کر رہے تھے وہ روح و بدن کی طہارت کے سبھی سامان کر رہے تھے۔ بھائی قاسم اور میں چپ چاپ ان کی تیاریاں دیکھ رہے تھے۔ جسم اپنی لاچارگی پر خود ہی آبدیدہ تھا۔ وصل کی خواہش تن کو اجڑی خزاؤں سے دور بہاروں کا راہی بنانے پر تلی ہوئی تھی اور وقت کی ساعتیں مجھ غلط کار سے گریزپا تھیں۔ انہی گریزپا ساعتوں کا آنچل تھامے میں وصل کی خیرات کی طالب تھی۔ بھاگتے دور ہوتے ہوئے لمحوں کو اپنی گرفت میں لینے کے جتن کر رہی تھی میری بے قرار روح۔ اس وقت جسم کو تپا ہوا تھا۔ تھرمامیٹر کے پیمانے سے ۱۰۰ ڈگری تک حرارت ظاہر ہوتی تھی۔ مگر دل کسی ایسی پابندی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جو وصل کی راہوں میں رکاوٹ بنے آہستگی

سے ڈرتے ڈرتے امی کی طرف دیکھا اور لفظ پھسل پڑے امی میں بھی چلوں۔ امی جان کا رد عمل میری توقعات کے عین مطابق تھا۔ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو اس حالت میں جاؤ گی وہ خفگی سے بولیں۔ پہلے سے کچھ بہتر ہوئی ہو کیا پھر پہلے والی حالت بنانا چاہتی ہو۔ آج آرام کر لو کل اگر بخار اتر گیا تو ضرور چلی جانا وہ سمجھاتے ہوئے بولیں میں نے ان کی بات کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔ مگر امی جان جونہی کمرے سے باہر نکلیں میں بلا سوچے سمجھے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلدی سے صاف کپڑے پہنے وضو کیا اور کمرے میں آ گئی۔ امی جان شاید غسل کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی عدم موجودگی میں جلدی جلدی کنگھی کی بڑے اہتمام سے خوشبو لگائی۔ وہ بہت سی میٹھی میٹھی خواہشیں جو حاضری کے سلسلے میں جانے کب کی دل میں بسی ہوئی تھیں۔ جاگ اٹھیں تھیں۔ مٹی مٹی ادھوری تصویریں وصل کے رنگوں میں رنگیں تر ہونے لگیں تھیں۔ ملن کے پھولوں بھرے گجرے میرے تن بدن سے لپٹ کر خوشبو بکھیر رہے تھے۔ مشام جان میں ہر طرف مہک ہی مہک رچی ہوئی تھی۔ جانے کیسی کیسی ادھوری تمنائیں تکمیل کے مرحلوں سے گزر رہی تھیں۔ میں تیار ہو رہی تھی۔ سج رہی تھی۔ بخار‘ درد‘ کمزوری میرے سب حریف میدان چھوڑ کر بھاگ چکے تھے میں وصل کی پھولوں بھری وادی میں ملن کے پھول چنتی پھر رہی تھی۔ ہاتھوں میں امیدوں کی پھولوں بھری ٹوکری پکڑے لفٹ سے اتری تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ملن ہی ملن‘ پھول ہی پھول‘ خوشبوئیں ہی خوشبوئیں‘ روشنی ہی روشنی‘ رنگ ہی رنگ‘ کتنی رنگین تھی ملن کی بیلا‘ کتنے مدھر تھے وصل کے لمحے‘ مجھے دیکھتے ہی امی جان حیرت سے میری طرف بڑھیں تم باز نہیں آئی نا اب اگر کچھ ہوا تو ہمیں نہ ستانا۔ کچھ ہو گا خود بھگتنا۔ نہیں پیاری امی کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اب دیکھ لیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں ان کو مناتے ہوئے بولی۔ پھر ہم سب پھولوں بھری روش پر چلتے ستاروں کے دیس میں پہنچ گئے وہ مستانہ مدھر دیس جدھر زندگی اپنے ہونے کی نوید پاتی ہے جہاں اندھی روشنیوں کو آنکھیں عطا کی جاتی ہیں جہاں چاند ستارے سورج حاضری کو آتے ہیں۔ جہاں شاہ و گدا سب برابر ہیں۔ وہ دیس حقیقتوں کی سچائی کا گواہ دیس‘ میرا اپنا‘ ہم سب کا ازل سے جنم جنم سے۔ اس دیس کی مٹی کو سجدے کرتی جبیں بھیگتی‘ سلگتی خواہشیں‘ جلتے تنگ

بجاتے جذبے، جمعہ، وہ مبارک و پر تقدس جمعہ، وہ سادہ پرنور وہ حیات آفرین جمعہ، حیات بخش گیا، صحت کا پیام بخش گیا، ہماری رہائش گاہ اور مسجد نبوی کے درمیان فاصلہ خاصا کم تھا۔ جو بھی فاصلہ تھا وہ بازار ہی میں کٹ جاتا۔ گلی گلی میں بازار جو رنگ برنگی سجی سجائی دکانوں کے سنگھار سے جگمگا رہے ہوتے حجاج آتے جاتے کچھ نہ کچھ خریدنے کے چکر میں لگے رہتے دکانوں کے سامنے سڑک کے کنارے جگہ جگہ حبشی عورتیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے سٹال لگائے بیٹھی ہوتیں۔ ہرگزر گاہ پر جا بجا بکھرے ہوئے سٹال لوگوں کی توجہ بے اختیار اپنی طرف کھینچتے تو نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ لینے پر مجبور ہو جاتے۔ مدینہ میں قیام کے غالباً چوتھے پانچویں دن ہم نے بھی بازار میں گھاتیں لگانی شروع کیں بھائی قاسم بھی بیماری کے عذاب سے پیچھا چھڑا کر ہمارے ہم قدم بن چکے تھے۔ ہم لوگ کبھی کبھار ان بازاروں میں (جو ہماری توجہ اپنے اصل سے ہٹ کر مادی جہاں کی طرف مبذول کراتے تھے) نکل جاتے ہر طرف بدیسی چیزیں عجوبہ روزگار چیزیں۔ چمکتی دمکتی چیزیں، نظروں کو اپنی طرف کھینچتی تو نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف متوجہ ہونا پڑتا۔ انسان بھی کیا بری شے ہے۔ اس پہ آنے والا کوئی موسم بھی دیرپا نہیں ہوتا۔ آتے جاتے موسموں کا مجموعہ ہے انسان جب اپنے اصل کی جانب لوٹے تو خود کو فنا کر دے اور جب جہاں کی طرف لوٹے تو فساد برپا کر دے۔ اسی انسانی فطرت کا شکار ہو کر ہم کبھی بازاروں کی طرف لپکتے۔ کبھی اپنے مرکز کی جانب دوڑتے۔ اس دوران بھائی نذیر بھی آ گئے تھے ان کی آمد پر زیارتیں جو کہ میدان احد و بدر۔ تاریخی مساجد اور اس کے قریب و جوار کے بابرکت مقامات پر مشتمل تھیں ان کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میدان احد کی زیارت وہ میدان جس کی مٹی سے اب بھی ان شہیدوں کے لہو کی خوشبو آ رہی تھی۔ جنھوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے سر کٹوائے تھے۔ میں نے جھک کر اس پاک مٹی کو اٹھایا اور آنکھوں سے لگا لیا۔ وہ مٹی جو خاک شفا تھی اس کی بھینی بھینی مہک دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ دل اس مٹی میں مل کر اس کا حصہ بن جانے کی خواہش کر رہا تھا۔ باجی کا ہاتھ تھامے حضرت حمزہؓ کے مزار مبارک پر جا پہنچی آپ کا مزار مبارک نظروں کے دائرے میں تھا۔ آنکھیں ان کو تعظیم پیش کر رہی تھیں۔ دل سلامیاں دے رہا تھا اور لفظ دعاؤں کے پھول چڑھا

رہے تھے۔ اس کے بعد ہم مسجد قباء اور مسجد قبلتین کی زیارتوں کے لیے گئے وہاں نوافل ادا کیئے وہ دن ہم نے اپنے حال سے بے خبر ہو کر ماضی کے شبستانوں میں بتا دیا۔ ماضی کے خوش رنگ پھولوں کی مہک دل کے بے رونق اجڑے گلشن میں پھیل رہی تھی۔ دل کی دنیا پر عجیب بہار آئی ہوئی تھی۔ وہ خواہشیں جو کبھی نا امیدی کے دامن سے لپٹ کر روتی رہتی تھیں۔ یوں تکمیل پا گئیں کہ خود حیران رہ گئی۔ دن گزر رہے تھے بڑی تیز رفتاری سے صبح ہوتی تو پھر جلدی ہی شام کے سائے پھیلنے شروع ہو جاتے۔ سورج گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ بڑا جلد باز بڑا ظالم تھا سورج بھی۔ جلدی جلدی جانے کی فکر میں لگ جاتا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کی جلد بازی کسی جان کا عذاب بن جاتی ہے ہم گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر انہی چکروں میں دن بتا دیتے۔ آتے جاتے طیبہ کے کوچہ و بازار کی رونقیں اذانوں کی روح پرور صدائیں، حجاج کی سرگرمیاں ایک میلہ کا سماں لگتا تھا۔ ایسا میلہ جس میں روح و دل شامل تھے۔ طیبہ کی پرنور فضائیں میٹھی میٹھی ادائیں، خوبصورت صبحیں، دلکش شامیں، جھلملاتی روشنیاں، ایمان کی حرارتیں، ہمیں ہر دم ہر گھڑی اپنی خوش نصیبی کا احساس دلاتیں کتنے خوش بخت تھے ہم۔ جس کی چاہ کی اسے پا لیا۔ لیکن بعض اوقات جدائی کی گھڑیوں کی چبھن آنکھوں کو ستانے لگتی۔ دل میں ہجر کی زردیاں پھیل جاتیں روح پر فراق کے سیاہ سائے منڈلانے لگتے۔ تن درد کے شعلوں میں جلنے لگتا یا خداوندا کیا سدا کے لیے یہاں قیام نصیب ہو سکتا ہے؟ کیا زندگی کا سفر یہیں ختم نہیں ہو سکتا؟ عمر کا موسم یہاں ٹھہر نہیں سکتا؟ جانا تھا یہ خبر تھی مگر جانے کا سوچ کر بھی جان لبوں پر آ جاتی تھی۔ کیا واقعی یہ گلیاں، یہ بازار یہ فضائیں، یہ صدائیں چھوٹ جائیں گی، نمازیں اذانیں، تکبریں، مجھے جکڑنے لگتیں کیا واقعی یہ لمحے بچھڑ جائیں گے۔ کہیں یہ مختصر وصل کے لمحات خواب تو نہ تھے۔ پگلی میرا دل رو دیا۔ خواب ہوتے تو ان کے دامن سے لپٹنا کیسا۔ یہ حقیقتیں ہیں اور حقیقتوں کے دکھ ہی جان لیوا ہوتے ہیں۔ جن پر صبر مشکل سے آتا ہے۔ جن کی اذیت لمحہ لمحہ تڑپاتی ہے میں عمر کے باقی لمحے کیسے کاٹوں گی۔ یہاں سے جا کر کیسے جی سکوں گی پھر بہت سے سوال بہت سے رشتے زنجیروں کی طرح مجھ سے لپٹنے لگتے۔ کچھ معصوم سے اداس چہرے میرے تصورات میں در آتے

جن کی ننھی ننھی آنکھوں میں جدائیوں کے دیپ جلتے بجھتے نظر آتے جن کے معصوم لبوں پہ جدائیوں کی پیاس پھیلی ہوئی نظر آتی جن کی ننھی ننھی بانہوں کے ہار میری طرف بڑھنے کو بے قرار نظر آتے جن کے اداس چہروں پر انتظار کا موسم ٹھہرا ہوا نظر آتا وہ محبتیں جو بچھڑ گئی تھیں، وہ محبتیں جو بچھڑنے کو تھیں ان کے درد کے پڑاؤ تن کی نگری میں پھیلے ہوئے تھے نہیں مجھے قسم ہے تیری۔ اے پالنے والے اگر در محبوب کی پناہ میسر آجائے تو میں ان تمام محبتوں کو خیرباد کہہ کر اس حقیقی محبت کا دامن تھام لوں گی۔

***

رنگ برنگے سول اٹھے جاندے چیرنیں جی نوں
ایتھو دے دکھ نال لیجاواں اگلے سونّیاں کیھنوں

وہ دن عام دنوں سے ہٹ کر تھا۔ دن جس کا پیغام صبح کا سورج لایا اک بالکل ہی جدا انداز کے ساتھ شروع ہو رہا تھا۔ ہمارا معلم دو دن سے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ تم لوگوں کے آٹھ دن پورے ہو گئے ہیں تم لوگ جاؤ ہم نے اسے بیماری کا بتا کر نمازوں کے پوری کرنے کا بہانہ بنایا ہوا تھا۔ مگر رات کو اس کا آدمی بتا گیا تھا کہ تم لوگوں نے شیڈول سے زیادہ رہ لیا ہے اب صبح ضرور جانا ہوگا۔ ساری رات طیبہ میں ملنے والے لمحوں کو یادوں کی مالا میں پروتے گزر گئی۔ وہ ہمارا منہ اندھیرے اٹھنا چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتے ہوئے بازاروں سے ہوتے ہوئے مسجد نبوی میں داخل ہونا اذان کی پر سحر آواز‘ جذبوں کے جنوں‘ نمازوں کی ادائیگی اور ان کی مٹھاس صبح نماز کے بعد مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے میمن ہوٹل تک پہنچنا۔ معمول کے مطابق ہوٹل سے چائے وغیرہ لینا اور پھر موقع پاتے ہی کھلونوں والے شیخ سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کا مول تول کرنے کا شغل پر پھر مدینے کی ٹھنڈی مہربان گلیوں سے گزرتے گھر پہنچ جانا ہمارے شب و روز کے یہی معمول تھے۔ میمن ہوٹل والے۔ کھلونوں والا شیخ اور یثرب کے کوچہ و بازار ہمیں جان گئے تھے۔ ہمارا ان کا دن رات کا ساتھ تھا۔ رات کو وہاں سے گزرے تو اپنے مہربان ساتھیوں کی اداسی چھپی نہ رہ سکی۔ ہمارے دوست لمحے لمحے کے ساتھی وہ کوچہ و بازار اداس اداس تھے بھیگے بھیگے سے تھے۔ آخر کو ہم ان کے اتنے دنوں کے ساتھی تھے اور وہ ٹھہرے ازل کے وفادار دوست۔ مہمان نواز ساتھی اپنی روایت کے مطابق وفا ان کی خو تھی۔ ان کی مٹی میں رچی ہوئی تھی آنے والوں کے لیے ان کے دل میں بہت جگہ تھی شاید یہی خوئے وفا تھی جو کہ انہیں اداس کیے

ہوئے تھی۔ میمن ہوٹل والے کھلونوں والا شیخ اور ٹھنڈے میٹھے مہربان رستے ہمیں الوداعی نظروں سے تک رہے تھے۔ ان دیواروں ان گلیوں سے گلے ملتے ہوئے میں بے اختیار ہو گئی تھی۔ دل کے الاؤ کچھ سرد سے پڑ گئے تھے شاید ان کھلے ظرف والوں نے میرے درد کو بانٹ لیا تھا۔ صبح تہجد کے وقت ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے وضو کرتے ہوئے بار بار آنکھیں بھر آئیں اور میں اس پانی کو وضو کے پانی سے دھوتی رہی اس دن ہم سب خاموش تھے۔ ایک دوسرے سے بولتے ہوئے کترا رہے تھے بظاہر ساتھ ساتھ مگر حقیقتاً گریزاں ہر کوئی اپنے جذبات کی سولی پر لٹکا ہوا تھا۔ ہر کوئی جدائیوں کی اذیت سے سہما ہوا تھا۔ نماز ادا کی محبوبؐ کے شہر میں ادا کی جانے والی آخری نماز یثرب کی ہواؤں کو دل میں اتارتے ہوئے جسم میں محفوظ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے چھپ کر روتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔ مگر کیسی دعائیں کہاں کی دعائیں وہاں تو تشنگی کے صحرا تھے جانے کیسی تشنگی تھی جو مٹ کر بھی نہ مٹی بلکہ مٹانے سے اور بڑھ گئی۔ جانے کیسی پیاس تھی جو جنموں پر پھیل گئی تھی۔ ہم لوگ آخری زیارت حبیبؐ کو چل دیئے۔ باادب نظریں ٹھہرے ہوئے قدم لرزتے بدن ٹوٹے قلب کے ساتھ سب اپنے اپنے دکھوں کی شدتوں میں ڈوبے جا رہے تھے پہلی معجزاتی حاضری کے بعد متعدد بار حاضری کے مواقع نصیب ہوئے تھے مگر آخری ملاقات کا درد ہی کچھ اور تھا تڑپ ہی سوا تھی۔ اس دن مسجد نبوی کے چپے چپے سے محبتوں کے پھول چنتے ریاض الجنتہ میں سجدے کیے مصلیٰ رسولؐ کے قریب پیشانی جھکائی جدھر جدھر جگہ ملتی سر جھکتا گیا۔ ہوتے ہوتے مرکز تک جا پہنچی۔ در محبوب کے سامنے حسب سابق سر جھکا کر کھڑی ہو گئی دل چاہ رہا تھا چیخ کر روؤں لپٹ لپٹ کر روؤں اتنا روؤں کہ میری ذات نمک کی طرح ان آنسوؤں میں گھل کہ بہہ جائے نہ جسم رہے نہ جدائیوں کے جھگڑے رہیں، نہ جڑ رہے نہ فساد پیدا ہو، نہ وجود رہے نہ دوریاں آئیں مگر پاس ادب نے ان جذبوں کو سختی سے دبائے رکھا۔ رخصت اے حبیبؐ مصطفیٰؐ کہ ہم جا رہے ہیں۔ ہجر کے صدمات کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے افسوس کہ قیام لمحاتی تھا۔ دکھ کہ جدائیاں دائمی تھیں سوختہ جان کہ جان کنی کا عالم ہے کتنا مختصر تھا وصل کا موسم کتنے طویل تھے ہجر کے زمانے۔ الوداع اے آقاؐ کاش یہاں رہنا تمام عمر

پر پھیل سکتا۔ کاش اس در کی غلامی مل سکتی شاید یہ ممکن نہیں مجھے جانا ہی ہے۔ آخری سلام یا رسولؐ عربی۔ آخری سلام اے محمدؐ عربی آپؐ کے شہر مقدس میں یہ بانوری دل کو لگانے کی جسارت کر بیٹھی اب کیا ہو کہ دل جانے کا سن کر بس میں نہیں رہا۔ مجھے قرار دیجئے۔ مجھے صبر دیجئے کہ جدائی کے جان گسل لمحات سے نبٹ سکوں۔ جانے پر خود کو آمادہ کر سکوں۔ افسوس کہ جان ہجر کی سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔ درد رگ رگ میں پھیل رہا ہے۔ اس درد محبت نے بڑا بے بس بنا ڈالا ہے کیسے جی سکوں گی کیسے رہ سکوں گی اتنی روشنیوں کے بعد زیست کے اندھیرے کیسے برداشت کر سکوں گی پیار کی نرم نرم چھاؤں کے بعد دھوپ کی سختیاں کیسے جھیلوں گی کاش یہ اجالے یہ روشنیاں ہمیشہ کے لیے مجھے مل سکتیں۔ الوداع اے جدائیو خاک ڈال دو دکھوں کی میرے سر پر۔ جی بھر کر خوشیاں منا لو کہ تم جیت گئیں۔

ہم اپنے کمرے میں پہنچ کر بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہے تھے اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے سامان اکٹھا ہو گیا تو اسے سب نے مل جل کر اٹھانا شروع کر دیا بھائی قاسم اور بھائی نذیر لفٹ سے سامان نیچے پہنچاتے رہے اور پھر آن کی آن میں ہمارا گھر ویران ہو گیا۔ مدینے میں زندگی رواں دواں تھی لوگ اپنے اپنے معمولات میں مگن تھے یہ نہ جانتے تھے کہ جدائیوں کی سوغاتیں سنبھالتے ایک مسافر سفر پر چلنے کو تیار ہے وہ مسافر کہ آبلہ پائی جس کا مقدر بن چکی تھی۔ ہر پل ملن کی آس جدائی کا دھڑکا۔ کیا زندگی ہے یہ بھی۔ دکھوں کی چادر بھیگتی جا رہی تھی۔ اندھیری راتیں پھر سے مسلط ہونے والی تھیں۔ سیاہیاں پھر سے زندگی کا حصہ بننے والی تھیں۔ بشریٰ چلو بیٹے امی جان کب سے میرے پاس آ گئی تھیں۔ انہوں نے میرے بھیگے ہوئے زرد چہرے کو دیکھا تو ہولے سے بولیں۔ دعا کرو بیٹے یہاں بار بار آنے کی لگن رکھو گی تو انشاء اللہ منظوری اپنے آپ ہو جائے گی چلو کہ جانا ہے۔

میں نے مدینہ کی خاک اٹھائی اور اپنے پاس سنبھال کر رکھ لی۔ دیار حبیبؐ کو چھوڑتے وقت ضبط کیسے سلامت رہ گیا یہ معلوم نہیں پھر کار ہولے ہولے رینگتی مدینہ کے کوچہ و بازار سے گزرتی جدائیوں کی طویل راہ پر نکل آئی گنبد خضریٰ مینار مسجد نبوی پیچھے بہت پیچھے رہ گئے آنکھوں کی رسائی سے بہت دور ہو گئے۔ آنکھیں جیسے بے

نور ہو گئیں۔ کچھ بھی نہ رہ گیا گھور اندھیرے ہر طرف چھا گئے۔ ہم سب کار میں خاموش بیٹھے تھے شاید اس وقت ہم سب کے جذبات یکساں، دکھ سانجھے تھے۔ طیبہ کو چھوڑ کر جیسے اپنا سب کچھ چھوڑ آئے تھے یوں لٹ لٹا کر ہار بیٹھے تھے کیا خیال ہے کچھ پی نہ لیا جائے۔ بھائی نذیر اس طویل خاموشی سے اکتا کر بولے جو کب سے طاری تھی مگر جواب میں پھر وہی خاموشی۔ دیکھئے اگر آپ لوگ یونہی اداس بیٹھے رہے تو میں کار مدینہ کی طرف موڑ لوں گا۔ معلم سے نپٹنا آپ کا کام۔ میں مدینہ پہنچا دوں گا۔ وہ ہنستے ہوئے بولے اس وقت کار کا ماحول اتنا خاموش تھا کہ وہ پریشان ہو رہے تھے۔

ان کی بات سن کر سارے جیسے جاگ اٹھے۔ بیٹے اگر اختیار میں ہوتا تو شاید ابھی وہاں سے واپسی کا سوچتے بھی نہیں مگر وہاں رہنا اپنے اختیار میں کہاں ہے اور مدینہ چھوڑتے وقت اداسی ایک فطری امر ہے جس پر اپنا کوئی زور نہیں امی اداس لہجے میں بولیں۔ امی جو کہ دوسری مرتبہ اس سعادت سے سرفراز ہوئی تھیں مگر میں دیکھ رہی تھی کہ ان کی حالت ہم سب سے سوا تھی۔ شاید یہ تشنگی کبھی نہیں مٹتی بار بار مٹانے سے اور بڑھتی ہے کہ اس کی کوئی تھاہ کوئی کنارا نہیں۔ بھائی نذیر نے کار ایک پٹرول پمپ پر روک دی۔ سعودی عرب کے تمام پٹرول پمپ بڑے وسیع و جدید تھے وہ پٹرول پمپ جو مدینہ اور جدہ کے راستے آیا نجانے کیوں یاد رہ گیا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہر طرف خاموشی اور سکوت کو توڑتی موسیقی کی لے، جانے گانے والا کیا گا رہا تھا۔ عربی کے اس گانے کے بولوں کی سمجھ تو نہ آ سکی مگر اس کی لے اس کی طرز ایسی مدھر تھی کہ میں ڈوب گئی۔ پتہ نہیں ان بولوں میں کیا تھا کہ دل جو پہلے ہی گداز سے بھرا ہوا تھا چھلک پڑا شاید گانے والا بھی ہجر کے فسانے بیان کر رہا تھا جدائیوں کے نوحے گا رہا تھا۔ اس کی آواز کے سوز نے مجھے مجسم سوز بنا دیا اس کے گلے کے نور نے میرے چاروں طرف ہالہ سا بنا دیا ٹھنڈی بوتل پکڑے پکڑے گرم ہو گئی بسکٹوں کا پیکٹ گود میں دھرا کا دھرا رہ گیا کار چلتی رہی اور اس گانے کے بول میرے تعاقب میں لگے رہے اور میں گم سم بیتے دنوں کے طلسم میں کھوئی رہی۔ شہر محبوب سے ہم لوگ سیدھے جدہ پہنچے اس وقت شام اتر آئی تھی۔ سارے چونکہ تمام دن کے تھکے ہوئے تھے جلد ہی سونے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ صبح ہم لوگ جلد بیدار ہو گئے۔

جمعہ کا دن تھا اور ہم جمعہ کے وقت سے پہلے مکہ پہنچنا چاہتے تھے ہمارے تمام گندے کپڑے جو قیام مدینہ کے دوران جمع ہو گئے تھے راتوں رات بھائی نذیر نے دھلوا دیئے کیونکہ چھ بندوں کے تقریباً دس دنوں کے کپڑے تھے لہٰذا ان کا گھر دھوبی گھاٹ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف گیلے سوکھے کپڑوں کے ڈھیر۔ ہم نے جلدی جلدی ان کو سمیٹا احرام باندھے اور سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ بھائی نذیر کسی وجہ سے ہمارے ساتھ نہ آ سکے کچھ دنوں کے بعد آنے کا کہہ کر وہ ہمیں بس میں بٹھا گئے۔ مکہ جلد ہی آ گیا۔ مکہ کی سڑکوں پر بہت زیادہ گہما گہمی تھی فٹ پاتھوں پر ڈیرے لگائے حاجیوں کے گروپ، دکانوں پر حاجیوں کا ہجوم، راستوں پر چلنے والی خلقت کا اژدھام، ایک ہفتے کے اندر کتنا زیادہ رش ہو گیا ہے میں سوچ رہی تھی ہمارے مدینہ طیبہ جانے سے پہلے خلقت کی بھیڑ کا یہ عالم نہ تھا۔ اب تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری خدا کی خدائی ایک جگہ پر جمع ہو گئی ہے۔ حرم شریف کے گرد و نواح میں مسافر اترنا شروع ہو گئے تھے (ہم نے اپنے ٹھکانے یعنی محلّہ الجیاد کا بس کے ڈرائیور کو بتایا ہوا تھا کہ ہم وہاں اتریں گے) دھیرے دھیرے بس خالی ہونی شروع ہو گئی ہم اپنا پتہ بتا کر مطمئن بیٹھے تھے۔ مگر محلّہ الجیاد تھا کہ آ ہی نہ چکتا تھا۔ جمعہ کا وقت نزدیک آ رہا تھا مگر بس تھی کہ نئی سے نئی سڑکوں پر دوڑتی پھر رہی تھی محلّہ الجیاد اتنا دور تو نہ تھا۔ وہ تو حرم شریف کے قریب ہی تھا۔ پھر یہ بس ہمیں کہاں کہاں لیے پھر رہی ہے بھائی قاسم پریشان ہو کر اٹھے اور بس رکوا دی۔ اس بس ڈرائیور کو شاید محلّہ الجیاد کا پتہ ہی نہیں ہے یہیں اتر پڑتے ہیں کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں گے۔ بھائی قاسم کے کہنے پر ہم سب سامان سنبھالتے اتر پڑے۔ وہ جگہ ہمارے لیے قطعی انجان تھی۔ ایک اور پاکستانی جو ہماری ہی طرح نوآموز تھا۔ ہمارے ساتھ اترا تھا جانے وہ شہر کا کونسا حصہ تھا ہم میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا ہم سب نے سامان اٹھایا اور سمت کا اندازہ لگا کر حرم شریف کی طرف چلنا شروع کر دیا اتنی اترائی چڑھائی تھی ان راستوں میں کہ جلد ہی سب پسینے میں نہا گئے زیادہ فکر امی جان کی تھی۔ جن کی ایک ٹانگ میں کافی عرصہ سے مستقل درد رہتا تھا۔ مگر وہ اپنے اس درد کو نظر انداز کیے اس سفر عظیم میں سب کا ساتھ بھرپور طریقہ سے دیتی رہیں۔ اس وقت ان پہاڑی راستوں پر چلنے سے ان کا درد بڑھ جانے کا

خدشہ تھا۔ جمعہ کا وقت تنگ ہوتا جا رہا تھا ہم سب کی خواہش تھی کہ جمعہ حرم شریف میں پڑھا جائے۔ اسی خواہش کے تحت سب اپنی پوری رفتار سے چل رہے تھے۔ کہنے کو تو وہ فاصلہ میل ڈیڑھ میل کا ہی تھا۔ مگر اونچے نیچے پہاڑی راستے اور دھوپ نے حلق میں کانٹے اگا دیئے۔ دیر ہو جانے کے ڈر سے ہم سب چلنے پر زور دے رہے تھے خدا خدا کر کے حرم شریف نظر آیا۔ تو جان میں جان آئی۔ امی جان بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے بھائی قاسم کو سامان پہنچانے کے لیے کہا اور ہم سب حرم شریف کی طرف بڑھ گئے ابھی قریب پہنچے ہی تھے کہ اذان شروع ہو گئی۔ سب نے اندر جانے کی جستجو شروع کر دی۔ اس دن حرم شریف کے اندر و باہر انسانوں کا سیلاب عظیم تھا۔ ہر دروازے کے آگے بپھرتے پانی کی لہریں' ایک دوسرے کو کاٹتی' توڑتی چیرتی لہریں' باریابی کی طلبگار لہریں' دروازے انسانی لہروں کے وجود سے بند محسوس ہو رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کے کاندھوں کو پھلانگنے اندر جانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ اسی کوشش میں گر رہے تھے۔ مگر گرے ہوؤں کو اٹھانے کی ہوش کسی کو نہ تھی لوگ نیچے گرے ہوؤں کو لتاڑتے کھڑے ہوؤں کو دھکے دیتے اندر جانے کا حیلہ کر رہے تھے یہ سب کچھ دیکھ کر ہم لوگ پلٹ آئے۔ اندر جگہ حاصل کرنے کا سوچنا بھی حماقت تھی۔ باہر نظر دوڑائی تو معاملہ کچھ کچھ اندر سے ملتا جلتا پایا۔ حرم شریف کے چاروں طرف تاحد نگاہ لوگ صفوں میں بیٹھے تھے جن کے پاس جاء نماز تھی وہ ان کو بچھائے بیٹھے تھے اور جو جاء نماز سے محروم تھے وہ ننگی زمین پر بڑے سکون سے بیٹھے تھے۔ کنکر' گرم زمین اور سر پر جلتے سورج کا سائبان کیا شان تھی ان عشق کے ماروں کی جو چبھتی دھوپ اور جلتی زمین میں یوں بیٹھے تھے جیسے اس سے زیادہ آرام دہ جگہ دنیا میں اور کوئی نہ ہو۔ اندر جانے کا خیال چھوڑ کر ہم نے باہر مناسب جگہ تلاش کرنی شروع کی مگر جمعتہ المبارک اور پھر حج نزدیک ہونے کی وجہ سے باہر بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ میں امی وغیرہ سے تھوڑی آگے نکل آئی دیکھتے دیکھتے ایک قدرے خالی جگہ دیکھ کر ان کو بلانے کی غرض سے مڑی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ امی جان سیڑھیوں کے پاس سے پھسل گئی تھیں شدید تکلیف کے آثار ان کے چہرے سے عیاں تھے۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی ان تک پہنچی دیکھا جس ٹانگ

پر پہلے تکلیف تھی وہی پاؤں مڑ گیا تھا ان کا ٹخنہ بڑی تیزی سے سوج رہا تھا۔ چوٹ والی جگہ پر نیل ابھر آیا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی ان کے پاؤں کی مالش شروع کی مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔ امی میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں تکلیف کی زیادتی کی وجہ سے ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ شدت درد سے بے اختیار ان کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس اثنا میں جمعہ کا خطبہ شروع ہو چکا تھا۔ وائے قسمت کہ وہ مبارک گھڑی بھاگ دوڑ کی نظر ہو رہی تھی۔ امی نے تکلیف کے باوجود باجی کا بازو تھام کر چلنے کی کوشش شروع کر دی جانے تن کے اندر عشق کے کتنے سودے سمائے ہوئے تھے کہ سوختہ جان جسم کو گھسیٹے گھسٹتی جا رہی تھی۔ جانے وہ کیسی کیفیت تھی۔ جس کا کوئی رنگ کوئی روپ نہ تھا۔ مگر وہ سب رنگوں پر حاوی آ گئی تھی میں آگے آگے اپنے چھوٹے سے نیم جان قافلے کی راہبری کر رہی تھی خطبے کے لفظ ہمارے جسموں پر ساون کی ٹھنڈی پھوار کی مانند برس رہے تھے۔ بول ہماری روحوں کے آئینوں پر پڑی ہوئی گرد صاف کر رہے تھے۔ شوق ہمیں محسوسات کی اس وادی میں لے آیا تھا۔ جہاں ہر طرف خوش رنگ پھول مہک رہے تھے۔ ہمارے قدموں کے نیچے اطلس و کمخواب کا فرش بچھا تھا۔ سر پر ٹھنڈے گھنے سائے آسمانوں سے حیات کے پیغام نو کی صدائیں، کتنا خوبصورت ماحول تھا۔ مستانہ سماں تھا۔ تن کی تکلیفیں من کے جذبوں کے آگے ہار رہی تھیں۔ کیا طور تھے محبت کے۔ کیا انداز تھے دل کی لگی کے عشق ہمیں بے خودی کی اس منزل پر لے آیا تھا۔ جہاں وجود فنا ہو چکے تھے۔ ہم سب دو زانو بیٹھے تھے۔ بند آنکھیں، تڑپتے سینے، چھلکتے آنسو، سلگتے تن، بندھے ہاتھ، اس عظمت والے کی بندگی نس نس میں لہو کی مانند دوڑ رہی تھی، پکار رہی تھی۔ نہاں خانہ دل میں اجالے بکھرا رہی تھی۔ ہمارے نیچے بچھے ہوئے نرم نرم اطلس و کمخواب کے بچھونے ہمیں راحت بخش رہے تھے۔ اس خود فراموشی کے عالم میں ادا کی جانے والی صلوٰۃ کے رنگ ہی جدا تھے۔ لذتیں ہی نرالی تھیں پیاس ابھی باقی تھی گو اندر ایک بوند بھی مزید نہ سماتی تھی اور پینے کی خواہش لیے اس ساغر و ساقی کے میکدے سے نکل آئے۔ کافی دیر ہو گئی اس جنرل سٹور پر بیٹھے ہوئے جو ہماری رہائش گاہ سے بالکل قریب تھا۔ ہم اشیائے خورد و نوش اسی اسٹور سے خریدتے تھے اسی وجہ سے وہ ہمیں

کافی پہچانتے تھے۔ حرم شریف سے آتے ہی ہم اس اسٹور میں گھس گئے۔ ٹھنڈے ٹن ڈیپ فریزر سے نکالے اور خالی کر دیئے مگر ایک ٹن سے پیاس بجھ نہ سکی ایک کے بعد دوسرے ٹن نے اس آگ کو تھوڑا کم کیا جو پیاس کی صورت جسم میں جل رہی تھی گھر کی چابیاں بھائی قاسم کے پاس تھیں اور وہ کہیں نظر نہ آتے تھے۔ امی کا پاؤں بہت بری طرح سوج چکا تھا۔ میں اوپر کمرے تک جا کر دیکھتی ہوں۔ شاید بھائی آ گئے ہوں گو کہ اس کی امید نہ تھی۔ مگر اتنی دیر سٹور میں بیٹھ کر انتظار کرنا بھی خاصا تکلیف دہ عمل تھا۔ اگر بھائی نہ آئے تو تالہ تڑوا لیں گے' میں نے کہا اور تیز تیز چلتی سیڑھیاں پھلانگتی کمرے تک پہنچی تو دروازہ کھلا پایا۔ اندر جھانکا تو بھائی صاحب ایئر کنڈیشنڈ چلائے بڑے مزے سے لیٹے تھے واہ بھائی صاحب آپ یہاں آرام کر رہے ہیں اور ہم نیچے بیٹھے انتظار میں سوکھ رہے ہیں۔ میری آواز پر بھائی نے چونک کر میری طرف دیکھا تم اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو دوسرے کہاں ہیں۔ شاید انہوں نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً سوال داغ دیا۔ واہ جی واہ' کیا کہنے لاپرواہی کے یعنی آپ کو خبر تک نہیں ہے کہ ہم نیچے سٹور پر بیٹھے آپ کی اڈیکوں میں گم ہیں۔ میں جل کر بولی بھئی حج' بھائی اکثر مذاق سے مجھے عربوں والے انداز میں حج کہہ کر بلاتے تھے جس پر میں بہت چڑتی تھی) اب یہ میری غلطی تو ہے نہیں کہ تم لوگوں کو نیچے بیٹھنا پڑا یہ تو سراسر تمہاری اپنی لاپرواہی ہے۔ کیا حرج تھا اگر تم پہلے آ کر دیکھ لیتیں۔ خواہ مخواہ ہی سب کو تکلیف دی۔ ان کی بات ٹھیک ہی تھی غلطی تو ہماری اپنی تھی جو اتنا نزدیک بیٹھ کر انتظار کرتے رہے۔ اتنا نہ کیا کہ کمرے تک آ کر دیکھ لیا جائے میں شرمندہ سی انہیں بلانے چل دی۔ سب نیم جان بستروں پر پڑے ہوئے تھے عصر کے بعد ہولے ہولے خود کو سنبھالتے سب اٹھ کھڑے ہوئے امی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں ہمارے ساتھ تھیں۔ مغرب کی نماز حسب سابق باب عبدالعزیز کے سامنے ادا کی پھر اندر جانے کی کوشش شروع کر دی۔ ہم نے طواف شروع کر دیا کئی دنوں کے بعد رکا ہوا سلسلہ دوبارہ شروع ہو رہا تھا اور جب سلسلہ لالہ و گل چل نکلا تو جسم کی حرکت قابو میں نہ رہی جوش جنوں میں بدلتا گیا۔ قدم جیسے ہواؤں کے دوش بدوش چل رہے تھے۔ جسم جیسے کاغذ کا جہاز بن گیا تھا ادھر سے ادھر اڑتا پھر رہا تھا۔ اس روز

انسانوں کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی متلاطم لہریں سکون سے نا آشنا تھیں۔ کبھی اللہ کے بڑے گھر کے اطراف تو کبھی سعی کی طرف گھمن گھیریاں کھاتی ہوئیں تو کبھی برآمدوں کی وسعتوں میں پھیلتی ہوئیں۔ ہم بھی اس سمندر کی ایک ننھی سی موج تھے تیرتے تیرتے سعی کی طرف آ نکلے پھر وہیں رات پڑ گئی وہیں نماز شب ادا ہوئی وہیں احرام کھولا رات بھیگ رہی تھی۔ جب پڑاؤ کی طرف لوٹے امن سے اگلی صبح امی کی تکلیف عروج پر تھی وہ چاہتے ہوئے بھی نماز کے لیے ہمارا ساتھ نہ دے سکیں۔ نماز کے بعد لوٹے تو انہیں جاء نماز پر پایا سر بسجود رب کے سامنے استغفار کرتے ہوئے۔ اب ان کا اٹھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ان کو بڑی مشکل سے پاکستان ہاؤس تک لائی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر صاحبہ نے بڑی توجہ سے ان کا چیک اپ کیا۔ دوائیوں کا نسخہ مجھے تھما دیا میں اسی سابقہ جگہ پر دوائی لینے کی غرض سے پہنچی جہاں کچھ عرصہ پہلے اس سسٹر سے تکرار ہوئی تھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس سسٹر کی جگہ کوئی دوسری سسٹر کھڑی تھی نہ جانے کیوں میں اس سسٹر کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے جلدی جلدی دوائیاں سمیٹیں اور جانے کی غرض سے مڑی۔ سنئے پیچھے سے سسٹر نے پکارا۔ جی فرمائیے اس سامنے والے کمرے میں اپنی امی کو لے جائیے' وہاں سے ان کو پٹی اور مساج کرائیے اس نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم اس کمرے میں چلے گئے کمرہ خالی تھا۔ امی ایک کرسی پر ٹک گئیں اور میں کمرے کا جائزہ لینے لگی وہ غالباً ایکسرے روم تھا چھوٹا سا صاف ستھرا کمرو جس میں ایک طرف میز پر قرینے سے مرہم پٹی کا سامان سجا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک کاوچ اور ایکسرے مشین پڑی تھی۔ کن کو پٹی کرنی ہے بھئی ایک جانی پہچانی آواز گونجی میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو وہی سسٹر جس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے موجود تھی یا خدایا خیر میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرتے ہوئے امی جان کی طرف اشارہ کیا ان کو۔ میں سمجھی شاید وہ مجھے بھول چکی تھی۔ اسی لیے بڑے اعتماد سے بولی سسٹر یہ میری امی ہیں ان کا مساج اور ڈریسنگ کرنی ہے۔ اچھا تو یہ آپ کی امی ہیں۔ آپ پھر آ گئیں وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی مارے گئے اس نے تو پہچان لیا ہے۔ جی سسٹر ہم نے آپ سے دل لگا لیا ہے آپ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے تو چلے آتے ہیں۔ میں نے شرارت سے کہا۔ واہ بھئی

واہ کیا انداز ہیں دل لگانے کے۔ وہ جل کر بولی آپ کو ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ملا جو انہیں ساتھ لے آئی ہیں وہ امی سے مخاطب ہو کر بولیں۔ امی حیرت سے ہمیں دیکھ رہی تھیں اس نوک جھونک کے پس منظر سے وہ قطعی بے خبر تھیں کیا مطلب ہے آپ کا۔ وہ الجھتے ہوئے بولیں' مطلب یہ کہ ہر مریض کے ساتھ یہ دوڑی دوڑی چلی آتی ہیں۔ خود تو انہیں کچھ ہوتا نہیں ہے دوسروں کے ساتھ آنے کی بہت شوقین ہیں اور یہاں آکر ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع کرتی ہیں۔ وہ ابھی تک مجھ سے خفا تھی سسٹر یہی تو ہم میں اور آپ میں فرق ہے ہم آپ سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور آپ ہم سے ملنے کو وقت کا زیاں سمجھتی ہیں۔ خیر اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا' جانے اس نوک جھوک میں کیسا لطف آ رہا تھا کہ میں واقعی اپنا اور اس کا وقت ضائع کر رہی تھی۔ یہ سن کر وہ چڑ سی گئی پلیز آپ خاموش بیٹھیں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ یہ اس طرف سے اعلان تھا جنگ بندی کا مجھے نا چاہتے ہوئے بھی چپ ہونا پڑا امی کو پٹی باندھ کر اس نے ایک ٹیوب میں سے تھوڑا سا مرہم نکالا۔ اور ڈبیہ میں ڈال کر امی کو دے دیا۔ کیا ہمیں کل پھر آنا ہوگا۔ جنگ بندی کی رسم کے باوجود مجھے بولنا پڑ گیا۔ کیا مطلب وہ تیکھی نگاہوں سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ اس ڈبیا میں جو مرہم آپ نے دیا ہے وہ غالباً آج کے دن کا ہے۔ کل ہمیں اس کے لیے دوبارہ آنا پڑے گا اگر ہمارا آنا صرف مرہم کے لیے ہے تو پھر دو تین دن کا دے دیں۔ روز روز کے آنے سے بچ جائیں گے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔ یعنی یہ آپ کہہ رہی ہیں۔ محترمہ یہ مرہم تین دن کے لیے ہے۔ میں نے اسی لیے زیادہ دے دیا ہے کہ آپ کو روز روز آنے کی زحمت نہ کرنی پڑے اس نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا یہ مرہم تین دن کے لیے ہے؟ میں نے حیرت سے اس مختصر مرہم کو دیکھتے ہوئے کہا جو بمشکل ایک دن کے لیے تھا۔ جی ہاں یہ تین دنوں کے لیے ہے اس نے تین پر زور دیتے ہوئے کہا آپ چونکہ ضرورت سے زیادہ دوائی لینے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کی ضرورت کا مرہم آپ کو دیا ہے باقی جو بچ جائے گا۔ وہ کسی اور ضرورت مند مریض کے کام آ جائے گا وہ میرے ہی لفظ میرے منہ پر مارتی کمرے سے باہر نکل گئی اور میں اس مختصر مرہم کو لیے آ گئی۔

آپے پائیاں کنڈیاں تے آپے کھچنائیں ڈور

امی جان کی تکلیف میں دوائی کے استعمال سے کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ دوا کے استعمال نے انہیں مزید بے چین کر دیا۔ دو دن اسی صورت حال میں گزر گئے تیسرے دن بھائی نذیر بھی آ گئے انہیں ٹیلیفون کے ذریعے ان کی تکلیف کا پتہ چل چکا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک پاکستانی ڈاکٹر کا پتہ بھی لائے تھے۔ جو کہ سعودی حکومت کے زیر نگرانی چلنے والے ایک ہاسپٹل میں عرصہ تین سال سے کام کر رہے تھے۔ اگلے دن ہم اس ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے وہ ایک چھوٹا مگر صاف ستھرا ہسپتال تھا وہاں ہماری ڈاکٹر عبیدالرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی ان کا کمرہ عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے کے اندر چلے گئے۔ سامنے ادھیڑ عمر کے ایک صاحب سیاہ و سفید داڑھی کو چہرے پر سجائے اپنے مریضوں کو پوری توجہ اور ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ ہماری باری آئی تو عربی بولتے بولتے ڈاکٹر صاحب یکدم پنجابی پر اتر آئے امی اپنی تکلیف پوری تفصیل سے بتا رہی تھیں وہ بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مکہ میں رہتے ہوئے حرم شریف تک جانے سے معذور ہوں اس تکلیف نے مجھے پابند بنا کر رکھ دیا ہے کتنی بدنصیب ہوں کہ اتنا پاس ہوتے ہوئے بھی اللہ کے گھر سے دور ہوں' ان کے لفظ جذبوں کی اوس سے بھیگے ہوئے تھے ان کا چہرہ اندر کے کرب کا امین تھا۔ ڈاکٹر صاحب سر جھکائے غور سے سن رہے تھے یوں جیسے یہ ان کی اپنی روداد غم ہو۔ امی چپ ہوئیں تو ان کا جھکا ہوا سر اٹھا۔ بی بی سب سے پہلے تو اللہ سے دعا کریں اس کے آگے جھولی پھیلائیں۔ یہ سب آزمائشیں اسی کی طرف سے ہیں۔ اور شاید یہ ہمارا امتحان ہوتی ہیں میں تو فقط ایک وسیلہ ہوں اصل ڈور تو اس مالک کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے مجھ ناچیز کو یہاں تک پہنچایا ہے آپ مایوس نہ ہوں ہمت رکھیں۔ انشاء

اللہ آپ بہت جلد اپنے قدموں سے چل کر حرم شریف میں اپنے فرائض کی ادائیگی کریں گی کرسی پر بیٹھے ہوئے اس بارعب اور پرنور چہرے والے انسان کے لہجے میں اتنا یقین اتنا اعتماد تھا۔ کہ نا امید دل پرامید ہو گیا۔ انہوں نے ایک نسخہ لکھا میں ان دوائیوں کا ہسپتال کے سٹور سے پتہ کرواتا ہوں۔ شاید مل جائیں آپ اتنے میں نیچے ایکسرے روم میں جائیں اور ٹانگ کا ایکسرے کرائیں۔ یہ فقط آپ کی تسلی کے لیے کر رہا ہوں ورنہ مجھے یقین ہے کہ ہڈی بالکل ٹھیک ہے اور اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا' ایکسرے روم سے ایکسرے کرا کر ہم دوبارہ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے انہوں نے ایکسرے کا بغور معائنہ کیا۔ دیکھا بی بی میں نہ کہتا تھا کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا۔ بس ذرا اللہ کو آپ کی آزمائش منظور تھی۔ سو اب اس کا بھی وقت ختم ہو چلا ہے آپ مطمئن رہیے آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ یہ دوائیاں لیجیے ساری تو نہیں مل سکیں کچھ آپ کو بازار سے لینی پڑیں گی۔ انہوں نے مجھے دوائیاں تھماتے ہوئے کہا آپ ایک انجکشن لگوا لیں ساتھ والے کمرے سے اور اگر دوبارہ ضرورت پڑے تو پھر ایک آدھ انجکشن لگوا لیں وگرنہ مجھے امید ہے آپ کو دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر جو مسیحا ہوتے ہیں ہمارے دکھ درد میں ہمارے سب سے بڑے ساتھی ہوتے ہیں۔ تسلی دینا' امیدیں بڑھانا بھی ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ وہ لب گور مریض کو بھی زندگی کی نوید سناتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب جو ہمیں مکہ کے اس چھوٹے سے ہوسپٹل میں ملے سچ مچ کے مسیحا تھے کوئی اللہ والے تھے نجانے ان کے لفظوں میں کیا تھا وہ عام لفظوں سے ہٹ کر محسوس ہوئے انجکشن لگوا کر ہم سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب نظر آ گئے وہ ہاسپٹل کے دروازے پر تھے ہمیں دیکھ کر رک گئے میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں وہاں آپ کے لیے دعا کروں گا۔ آپ مکمل اطمینان سے گھر جائیے ایک آدھ دن آرام کریں اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مگر آرام آجانے کی صورت میں دوائیوں کا استعمال ترک نہ کیجئے گا وہ ہمیں خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے نہ جانے کیوں ان کا بولا ہوا ایک ایک لفظ یادوں کی کتاب میں رقم ہو گیا۔ وہ ایک صوفی منش ڈاکٹر تھے قطعی طور پر اللہ پر بھروسہ و توکل رکھنے والے اپنے بولوں میں لاکھوں دعاؤں کا اثر رکھنے والے وہ اللہ کے شہر میں

لفظوں سے مسیحائی کرنیوالے اور ان کی مسیحائی کا کرشمہ جلد ہی نظر آ گیا خدا جانتا ہے کہ وہ کوئی معجزہ تھا یا واقعی بقول ڈاکٹر صاحب کے کوئی آزمائش کہ ان کی دی ہوئی دوائیاں استعمال کرتے ہی آرام آنا شروع ہو گیا۔ اگلے دن امی جان چل پھر سکتی تھیں۔ ان کے اصرار کے باوجود ہم نے انھیں مزید ایک دن آرام کرنے دیا اور دو دن بعد ڈاکٹر صاحب کے لفظوں کی صداقت ہمارے سامنے تھی۔ ان کی حسب ہدایت دوائیوں کا استعمال جاری رکھا۔ مگر وہ مرض باقی نہ رہا تھا۔ جس نے ہمیں پریشان کر رکھا تھا جوں جوں حج کے دن قریب آتے جا رہے تھے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ حرم شریف کے باہر سڑکوں، پلوں، فٹ پاتھوں پر انسان نہیں سما رہے تھے کار منیٰ و عرفات جانے والی سڑک پر جا رہی تھی۔ ہم لوگ ان مقدس مقامات کی زیارت کے لیے نکلے تھے جہاں کچھ دنوں بعد ہماری حاضری تھی۔ ہم حج سے پہلے تسلی و اطمینان سے ان بابرکت مقامات کی زیارت کرنا چاہتے تھے کیونکہ حج کے موقع پر بے پناہ خلقت کے جمع ہونے پر ٹھیک طرح سے بعض دفعہ موقع نہیں ملتا۔ یہ وادی محشر ہے امی نے زمین کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا جہاں ابرہہ کی فوج کے ہاتھیوں کو ننھے ننھے ابابیلوں نے ڈھیر کر دیا تھا۔ یہاں رکنے کا حکم نہیں بلکہ یہاں سے تیز قدموں سے گزرنا چاہیے۔ امی نے مزید بتایا۔ جبل رحمت کے بالکل سامنے ہم کار سے اترے چھوٹے چھوٹے نیم کے درخت ہر طرف مسکرا رہے تھے پاس ہی ٹھنڈے مشروبات کا اسٹال تھا —— بالکل سامنے وہ پہاڑی تھی جس کو محبوب الٰہی کی قربت نصیب ہوئی تھی جس پر کھڑے ہو کر آپؐ نے انسانوں کو انسانیت کا وہ منشور دیا جو رہتی دنیا تک ہماری نجات کا ذریعہ ہے۔ ہم سب جیسے اڑتے ہوئے جبل رحمت پر چڑھ گئے ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ کپڑے ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے۔ اوپر بہت سے لوگ تھے ایک کیمرہ والا کیمرہ لیے ہر ایک کو تصویر کھنچوانے کی دعوت دے رہا تھا۔ مگر اس وقت اس کی دعوت پر توجہ دینے والا اسے قبول کرنے والا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ شہر مکہ کی سڑکیں حجاج کے قدموں کی چاپ سے گونجتی رہتی تھی۔ مصروف سڑکوں پر ٹریفک بند کر دی گئی تھی۔ وہ سڑکیں چلتے پھرتے انسانوں سے آباد تھیں۔ انسان جو سڑکوں پر ہر طرف پھیلے ہوئے ہوتے۔ نماز کے بعد تو اتنا ہجوم ہو جاتا کہ کھلی سڑکیں بند

محسوس ہوتیں۔ حج سے پہلے آنے والا آخری جمعہ قریب آتا جا رہا تھا۔ حرم شریف میں ان دنوں جگہ حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اپنی طرف سے جتنی بھی کوشش جلدی پہنچنے کی ہوتی ناکام جاتی۔ کیونکہ ہم سے بھی پہلے جگہ حاصل کرنے کے طلبگار صبح سے ڈیرے لگائے ہوئے ہوتے۔ یہ الگ بات کہ ان کا بیٹھنا صرف بیٹھنا نہ ہوتا۔ پاؤں پسار کر لیٹنا بھی اس بیٹھنے میں شامل ہوتا تھا۔ اس بیٹھنے والی جگہ میں سامان کی گنجائش تو باآسانی ہوتی مگر انسان وہاں جگہ پانے کی مہربانی حاصل نہ کر سکتے۔ باتوں کے لمبے چوڑے سلسلے۔ لڑائیوں کے مشغلے جاری ہوتے ایسے میں ہم سے بیچارے دھکے کھاتے باتیں سنتے کہیں نہ کہیں پھنس ہی جاتے۔ جمعہ کا دن آگیا تھا ہم لوگ صبح جلدی جلدی سارے کام نبٹا رہے تھے کھانا وغیرہ پکا کر نہانے دھونے کا اہتمام کیا اور ساڑھے دس بجے ہی گھر سے نکل آئے۔ باب بلال، باب حنین، باب جیاد آزما ڈالے مگر کہیں شنوائی نہ ہوئی دروازوں کے آگے لگی بھیڑ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تمام لوگ انہی دروازوں کے آگے آگئے ہوں۔ آخر ہم فیصلہ کن انداز سے باب اسماعیل کی طرف بڑھے وہاں بھی بھیڑ کا وہی عالم تھا مگر کیا کرتے جانا تو تھا۔ کوشش تو کرنی تھی۔ ابتدا اسی دروازے سے سہی اللہ کا نام لے کر ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے ہولے ہولے گھستے گھساتے بچتے بچاتے اندر داخل ہو گئے۔ اندر تک تو پہنچ گئے مگر اندر باہر سے بھی زیادہ بھیڑ تھی۔ برآمدوں میں جگہ پانے سے ناکامی پر لوگ سیڑھیوں پر راہداریوں میں جاء نماز بچھائے بیٹھے تھے۔ یا خدا اب کیا کریں۔ کدھر جائیں۔ اب یہاں مت کھڑی ہو آگے کو بڑھنے کی کوشش کرو۔ پیچھے سے باجی کی آواز آئی بسم اللہ پڑھ کر اس انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں قدم رکھ دیئے مگر قدم رکھنا بھی قیامت ہو گیا پاؤں رکھتے ہی بیٹھی ہوئی خواتین چیخ پڑیں۔ یلیلہ گم خلاص، خلاص کی دنیا سے نکلی تو یہاں جگہ نہیں ہے آگے جاؤ کی تکرار شروع ہو گئی وہاں سے اندھا دھند قدم بڑھائے تو بات دھکم پیل تک جا پہنچی۔ بیٹھی ہوئی محترم خواتین پکڑ کر آگے دھکیل دیتیں۔ دھکے کھاتی باتیں سنتی غصے بھری نگاہوں کا سامنا کرتی ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے برآمدے تک جا پہنچی وہ تو شکر تھا کہ امی و خالہ کو خوش قسمتی سے جگہ مل گئی تھی وہ سکون سے بیٹھ گئی تھیں دوسرے

ساتھیوں کا کچھ پتہ نہیں تھا کدھر گئے جیسے جیسے کسی کو پاؤں ٹکانے کی جگہ ملتی گئی بیٹھتے گئے جب بھٹکتے بھٹکتے آس پاس نظر دوڑائی تو کوئی بھی آشنا چہرہ نظر نہ آیا۔ آخر در بدر پھرتے پھرتے ایک جگہ پر رک گئی۔ کہیں بھی ٹکنے کو جگہ نہ مل رہی تھی اب کہیں ٹکنا چاہیے کسی سے زبردستی کرنی چاہیے۔ مگر صلح پسند طبیعت ان آخری لمحوں میں اپنے کئے کرائے کو ڈبونا نہیں چاہتی تھی کسی سے اونچی آواز میں بولنے اور جگہ کے حصول کے لیے نہ جھگڑنے کے عہد کو نبھانے کی کوشش رہی تھی۔ ان آخری لمحوں میں اپنے مسلک سے ہٹنا اچھا نہ لگا۔ کافی دیر اسی کشمکش میں گزر گئی کہ بڑھ کر جدوجہد کی جائے یا خاموشی سے انتظار کیا جائے ابھی اسی ادھیڑبن میں تھی کہ قریب سے آواز آئی ادھر آ جاؤ میرے پاس۔ وہ ایک مہربان چہرے والی ادھیڑ عمر خاتون تھیں' انہوں نے پاس بیٹھی ہوئی خواتین کو سمٹ کر بیٹھنے کو کہا۔ بہنو یہ بچی کب سے کھڑی ہے میں اسے دیکھ رہی تھی نہ تو اس نے بڑھ کر کہیں گھسنے کی کوشش کی اور نہ ہی اسے کسی نے جگہ دی اگر ہم تھوڑا سمٹ کر بیٹھیں تو یہ باسانی ہمارے درمیان بیٹھ سکتی ہے۔ انہوں نے پاس بیٹھی خواتین کو سمجھاتے ہوئے کہا جو ضرورت سے زیادہ پھیل کر بیٹھی تھیں ان کی بات پر انہوں نے ناگواری سے مجھے دیکھا اور تھوڑا کھسک گئیں۔ میں نے اس بالشت بھر جگہ کو غنیمت جانتے ہوئے جلدی بیٹھنے کی کوشش کی۔ وہاں بیٹھنے کو تو بیٹھ گئی مگر قرآن شریف ذرا دور فاصلے پر رکھے ہوئے تھے۔ نماز میں وقت تھا۔ اس لیے میں چاہتی تھی کہ خالی وقت میں تلاوت کر لوں مگر اس وقت اس نایاب جگہ کو چھوڑنا سراسر نقصان وہ امر تھا کیونکہ جگہ کی گھات میں میری جیسی کئی ضرورتمند آس پاس موجود تھیں ان کے جنگجویانہ تیور دیکھتے ہوئے ہمت نہ پڑی کہ جگہ چھوڑ دوں بس چپکی بیٹھی رہی۔ سامنے کی رو سے ایک خاتون قرآن شریف ہاتھ میں پکڑ کر اٹھیں تو میں نے ان سے قرآن مجید مانگ لیا۔ گرد و پیش میں کیا ہو رہا ہے پھر جاننے کی ضرورت نہ رہی۔ دو ایک دفعہ ان مہربان خاتون نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر میری محویت دیکھ کر خاموش ہو گئیں ابھی ایک پارہ ختم نہ ہوا تھا کہ جمعہ کی اذان ہو گئی جلدی سے قرآن کریم ایک بی بی جو سٹینڈ کی جانب جا رہی تھی پکڑایا اور بیٹھ گئی۔ نماز جمعہ ادا ہوئی شوق کے سفر کی منزلیں ایک ایک کر کے گزرتی جا رہی تھیں۔

قدم آگے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے ٹھہرنا رکنا وہاں کی ریتوں کے منافی تھا۔ چلنا چلتے رہنا شاید وہاں کی ریت تھا اور ان ریتوں کو نبھانا ہی اپنا مقصد حیات تھا۔ ہفتہ کا دن منیٰ کی تیاریوں میں گزر گیا وہاں کیونکہ چار پانچ دن کا قیام تھا۔ اس لیے کھانے کی خشک اشیاء و دیگر ضروریات زندگی کا مختصر سامان وہاں لے جانا تھا۔ تمام دن ان اشیاء کو ایک جگہ اکٹھا کرتے سنبھالتے گزر گیا دن جو وہاں کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئے تھے۔ اتنے تیز کہ بعض اوقات تو ان کی تیز رفتاری پر الجھن سی ہوتی تھی۔ مگر شاید انہیں گرفت میں لینا بس سے باہر تھا۔

صبح نماز کے وقت حرم شریف کافی حد تک خالی ہو چکا تھا۔ وہ بھیڑ چھٹ چکی تھی جو ایک دن پہلے تھی لوگ اپنے اپنے معلموں کے پروگرام کے مطابق رات سے ہی منیٰ روانہ ہونا شروع ہو گئے تھے نماز کے بعد حرم شریف سے نکلے۔ قافلوں کی روانگی کے منظر قابل دید تھے لبیک کی صدائیں سڑک سے گزرنے والی بسوں، کاروں، ویگنوں سے نکل نکل کر فضاؤں میں بکھر رہی تھیں سڑکیں، مکان بازار، دوکانیں، فضائیں، ہوائیں زمین و آسمان سب مل کر لبیک لبیک کا ورد کر رہے تھے۔ ایمان کی حرارت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ رگوں میں جمنے والی برف پگھلتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف بہاروں کا موسم ہر طرف پھول ہی پھول رنگ ہی رنگ بکھرے تھے لبیک کی اوس میں ہمارے بدن بھیگے جا رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی، بھیگی بھیگی اوس جسموں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ طالبان شوق کے قافلوں کی روانگی ہمارے قدموں کو بھی تیزی بخش رہی تھی دوپہر تک لوگ مکہ چھوڑ چکے تھے۔

* * *

تو ہیوں ہیں، میں ناہیں سجناں، تو ہیوں ہیں، میں ناہیں

ہم اپنا مختصر اسباب اٹھائے اس ٹیکسی کی طرف بڑھ رہے ہیں جو ہمیں منیٰ تک پہنچانے کی غرض سے کھڑی تھی۔ نئے کپڑے نئے احرام، نئی چادر، نئے جذبے، والہانہ شوق، سچی محبتیں، لہو کی حرارتیں، جذبوں کی جسارتیں، احساس کی حلاوتیں بہت کچھ لیے۔ دل کی ڈبیا میں بہت کچھ بند کیے چپ چاپ منیٰ کے راستوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو کہ آہستہ آہستہ سمٹ رہے تھے تمام راستہ لبیک کہتے اور سنتے گزر گیا یہاں تک کہ ہماری ٹیکسی اس خیموں کے عظیم شہر میں داخل ہو گئی جسے منیٰ کہا جاتا ہے۔ حد نگاہ تک خیمے ہی خیمے پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھلونوں کی طرح نظر آنے والے خیمے، گھاٹیوں میں بکھرے ہوئے خیمے، سفید، سیاہ و سبز رنگوں کے لباسوں میں مسکراتے ہوئے خیمے آنے والوں سے چپکے چپکے لبیک کی سرگوشیاں کرتے ہوئے خیمے اور کچھ ایسے بھی تھے جو خیموں کے تکلف سے بے نیاز سڑکوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے ڈنڈے گاڑ کر ان پر چادریں پھیلائے بڑے سکون و آرام سے جلتے سورج کے نیچے بیٹھے تھے کچھ عاشق ایسے بھی تھے جو چھتریوں کی چھاؤں میں بیٹھے تجدید وفا کر رہے تھے۔ ان میں لا تعداد ایسے بھی نظر آئے جو خیمے، چھتری، چادروں کے سائباں کے بغیر سورج کی روا سر پر تانے قبلے کی طرف منہ کیے سجدے میں پڑے تھے۔ اس لمحہ آرام و آسائش تن آسانیاں، نازک مزاجیاں پریشاں خیالی بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ سراسر روحوں کا سفر تھا۔ روحانیت کا ورد تھا۔ طلب کی منزلیں تھیں جستجو کی چاہتیں تھیں۔ شوق کے سفر تھے آزمائشوں کے راستے تھے۔ عشق کے مرحلے تھے۔ وہاں جسموں کا کیا کام، وہاں جسموں کا کیا خیال، جسم تو ایک ذریعہ تھے پہچان تھے۔ ایک نمونہ تھے اصل رابطے تو روحوں کے تھے جسم بیچارے تو محض ایک دکھاوا تھے جو روحوں کے ساتھ ساتھ گھسٹتے

چلے آ رہے تھے ہمارا معلم عبدالرحیم بنون تھا۔ اور سرزمین حجاز پر قدم رکھنے کے بعد پہلی بار معلم کی نگاہ کرم کے قابل ٹھہرے تھے۔ ٹیکسی والا بیچارہ لگ بھگ سوا گھنٹہ اس خیموں کے شہر عظیم میں ہمارا ٹھکانہ کھوجتا رہا۔ مگر افسوس کہ ناکام رہا۔ آخر کار ہم نے اس کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے سامان اتارا اور اسے فارغ کر دیا۔ بھائی نذیر نے ہمیں ایک دیوار کے سائے میں بٹھایا اور خود اپنا ٹھکانہ ڈھونڈنے چلے گئے جو کہ ہنوز گمشدہ تھا۔ ہم سائے میں بیٹھے چند روز کے لیے آباد ہونے والے انوکھے شہر کی رونقیں دیکھ رہے تھے جو کہ اس وقت زندگی کی حرارتوں سے بھرپور تھا۔ جس کے باسیوں کا لباس ایک، معمول ایک، مسلک ایک، مقصد ایک، ٹھکانے ایک، قرینے ایک، تمنائیں ایک، ولولے ایک تھے۔ وہاں مختلف نسلوں قوموں اور ملکوں سے آئے ہوئے جذبوں کے سفیر ایک سے جذبوں کی ڈوری سے بندھے ایک دوسرے کی شکلوں سے ناآشنا مگر منزلوں سے آشنا تھے۔ کیسا انوکھا و نرالا دیس تھا وہ۔ دنیا میں اپنی مثال آپ۔ دنیا میں اخوت، مساوات و نظم و ضبط کے لحاظ سے واحد شہر جہاں سب ایک سے لباسوں میں ایک سے ٹھکانوں میں قیام پذیر تھے وہ جگہ جہاں ہم بیٹھے تھے ایک گزر گاہ تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ سامان اٹھائے چہروں پر شوق کے رنگ لئے جیسے نئے جہاں فتح کرنے نکلے تھے۔ اک چمک اک تازگی چہروں پر لئے منزلوں کو اپنانے کے جوش میں فاتح چہروں والے کوملبس کچھ دیر گزری تو دیکھا بھائی نذیر تیز تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے ہم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ سامان اٹھائیں (ہمارا خیمہ نزدیک ہی ہے۔ انہوں نے بتایا)..... ہمارا خیمہ کیسا ہے۔ بھائی نذیر، میں نے اشتیاق سے پوچھا زندگی میں پہلا موقع تھا خیمے میں رہنے کا اور خیمہ بھی منیٰ کا تھا۔ سو اشتیاق لازمی تھا۔ خیمہ تو اچھا ہے مگر ایک مشکل ہے۔ کیا؟ وہ یہ کہ خیمے میں ہمارے ساتھ دو حاجی اور بھی ہیں اردو بولنے والے تو اس میں مشکل کا ہے کی بلکہ اچھا ہے ذرا رونق رہے گی میں نے کہا۔ ہاں واقعی رونق تو بہت ہو گی کیونکہ ان سے مل کر تم نے چپ ہونا نہیں اور اس چھوٹے سے خیمے میں ہر طرف رونقیں بکھر جائیں گی اور رونقیں بھی اردو کی ہوں گی۔ ایسے حالات میں ہم بیچارے پنجابی والے کدھر جائیں گے وہ مشکل کا اظہار کرتے ہوئے بولے تو سب بے اختیار ہنس پڑے بھائی نذیر مطمئن رہے

ہم پنجابی کو بھی وقت دیں گے میں نے ہنستے ہوئے کہا' مجھے تو فکر ہے کہ اس خیمہ میں پنجابی ممنوع نہ قرار دے دی جائے۔ وہ بظاہر تشویش سے بولے۔ تو ایسی صورت میں آپ خاموش رہییے گا۔ میں نے انہیں تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ہم سب یونہی باتوں میں مگن سامان اٹھائے اس شہر عظیم کی تنگ پیچ در پیچ اندر ہی اندر چلتی ہوئی گلیوں سے گزرتے اس خیمے تک جا پہنچے جو ہمیں ملا تھا چھوٹا سا خیمہ اور اس میں دو مہربان چہروں والے بزرگ ہمیں دیکھتے ہی یوں تپاک سے ملے جیسے پہلے سے ہی ہمیں جانتے ہیں۔ ان سے مل کر ہم نے اپنا سامان قرینے سے لگا دیا۔ نیچے زمین پر چٹائیاں بچھائیں اور اپنا گھر آباد کر لیا وہ دونوں بزرگ جو ہمارے ساتھی تھے انہیں ہم انکل اور آنٹی کی پہچان سے یاد کرتے تھے۔ اس دوران ہمارے بہت قریب آگئے تھے۔ وہ بڑے معصوم اور بے ضرر تھے وہ لوگ حج کی آخری فلائیٹ میں حج سے ایک دن پہلے ہی پہنچے تھے۔ اور دوسرے ہی دن رات کو معلم نے انہیں منیٰ پہنچا دیا تھا۔ وہ رات بھر کی بے آرامی تھکن اور مناسب غذا نہ ملنے کی وجہ سے کافی پریشان تھے۔ میں نے تھرماس سے چائے نکال کر دی تو پہلے ہی گھونٹ کے ساتھ انکل بولے بیٹا اس وقت تو یہ چائے آب حیات لگ رہی ہے۔ میں صبح سے تلاش کر رہا تھا۔ مگر مجھے یہاں چائے نہ مل سکی اپنے ساتھ ضروری سامان کی کمی کے سبب چائے بنا نہ سکے اب ایسے حالات میں یہ چائے نعمت لگ رہی ہے۔ میں تو پھر بھی گزارہ کر سکتا ہوں' مگر یہ آپ کی آنٹی کھانے کے بغیر تو رہ سکتی ہیں مگر چائے کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وہ ہنستے ہوئے بولے تو آنٹی مسکرا کر رہ گئیں انکل اور آنٹی ہمارے ساتھ ایسے گھل مل گئے تھے جیسے ہم ایک ہی گھر کے فرد ہوں ظہر کی نماز سب نے خیموں میں ادا کی۔ اذانوں کی آوازیں آس پاس کے خیموں سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ہر طرف صفیں بنائے لوگ با جماعت نماز ادا کر رہے تھے۔ خیموں کے باہر سورج جل رہا تھا۔ جلتے سورج اور ہمارے درمیان کپڑے کی ایک پتلی سی چادر حائل تھی۔ جو ان جلتی کرنوں کو ہم تک پہنچنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی مگر اس کی وہ کوشش ناکام ثابت ہو رہی تھی جلتی کرنوں سمیت سورج ہمارے خیموں میں بکھرا ہوا تھا مگر اس وقت ان جلتی کرنوں کو محسوس کرنے کا احساس ہی فنا ہو چکا تھا۔ کیا جسم اور کیسا اس کا آرام۔ کیسی

گرمی اور کہاں کے گرمی سے بچاؤ۔ وہاں جسم تو بظاہر نظر آتے تھے۔ اصل شے تو وہ تڑپ تھی وہ کرب تھے جو جسموں کو وہاں تک لانے کا سبب تھے۔ جو نظر نہیں آتے تھے وہ جذبے تھے جو محسوس کیے جاتے تھے۔ زندگی بظاہر جسموں کے رابطے میں جکڑی تھی مگر جسم اس وقت حقیقتاً بے وجود ہو چکے تھے۔ اندر کی دنیا کے رنگ چہار سو بکھر رہے تھے۔ ہر طرف داخل کے ہنگامے پھیل رہے تھے باطن کی حقیقتیں اتنی دلربا تھیں کہ ظاہری شورشیں دکھاوا لگ رہی تھیں۔ ایسا دکھاوا جو قطعی طور پر متاثر کن نہ تھا۔ منیٰ کے شہر میں شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی شام کے سرمئی اندھیرے میں سفید سفید خیمے چنبیلی کے پھولوں کی طرح سر اٹھائے کھڑے اپنی بھینی بھینی مہک سے دل و دماغ کو سرشار کر رہے تھے اس شہر ہزار داستان کی پر پیچ گلیوں میں زندگی کے ہنگامے ہولے ہولے بھیگی رات سے گلے ملتے ہوئے سرد پڑ رہے تھے جاگتی زندگی نیند کی آغوش میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ نیا ماحول' نئی جگہ نئے طور نئے طریقے صبح زندگی اپنے اصل کی طرف لوٹنے والی تھی وہ اصل جو زندگی کی وہ حقیقت تھا جس پر زندگی کی بنیادیں کھڑی تھیں۔ ہماری وہ پہچان جسے ہم آتی جاتی سانسوں کے ساتھ دل میں روشن رکھتے ہیں وہ اصل جس کی آرزو لہو کی ضرورت اور روح کا تقاضا تھی۔ وہ اصل جس کی تلاش میں قرنوں کی خاک چھان چکی تھی۔ اسی اصل کے انتظار میں وہ رات کاٹے نہ کٹتی تھی۔ وہ رات جو بہت طویل ہو گئی تھی۔ قرنوں پر پھیل گئی تھی۔ اندھیرے ہی اندھیرے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ اندھیرے جن کا وجود روشنیوں کی نفی کرتا ہے جن کا وجود خوف کا باعث ہوتا ہے اتنے گھرے تھے کہ صبح کا اجالا معجزے کا ظہور لگ رہا تھا۔ صبح کا نزول سپنا لگ رہا تھا۔ ایسا سپنا جو کبھی بھی تکمیل و تعبیر کی صورت نہیں بن پاتا۔ صبح یا خدا صبح جلد آئے یہ اندھیرے یہ سیاہیاں مٹ جائیں اب آ بھی چکو اب آ بھی جاؤ اے نور صبح کامل اب آ بھی جاؤ کہ انتظار کی سولی پر لٹکتے لٹکتے روح دریدہ ہوتی جا رہی ہے۔ روشنی اتنی دور بھاگتی جا رہی ہے۔ گریز پا کیوں ہے مجھ سے۔ اے میرے نصیبوں کی صبح لازوال اب آ بھی جاؤ کہ سفر بہت طویل ہوتا جا رہا ہے۔ شب کی سیاہیاں دل کا خون کیے جا رہی ہیں۔ تن کو پانی کیے جا رہی ہیں۔ اب تو ترس کھاؤ کہ اس ٹوٹے بکھرے تن کا کوئی بھی سر سلامت نہیں رہا۔

یہ تاراب بجتے بجتے ٹوٹ رہے ہیں۔ انہیں حیات کا وہ لازوال ساز بخشو کہ تمام زخم بے بسی بھر جائیں۔ وہ صبح۔ اندھیروں کی کوکھ سے جنم لینے والی صبح۔ وہ اجالوں کے ہم قدم سہج سہج چلتی ناز آفرین صبح بھٹکتے ہوئے راہیوں کی راہبر صبح۔ اللہ اکبر کی نوید لاتی روشنیوں کے سنگ سنگ چلتی یوں آئی کہ دھوم مچا گئی۔ ظلمتیں چھٹ گئیں۔ اجالے بکھر گئے۔ لاؤڈ سپیکر سے معلم کی بسوں کے آنے کا اعلان بار بار ہو رہا تھا۔ حجاج کے قافلے ان بسوں کی آغوش میں چھپتے جا رہے تھے۔ جو قطار کی صورت میں کھڑی تھیں۔ ہم بھی قافلے کے سنگ اسباب سمیٹے ان بسوں کی جانب بڑھ رہے تھے جن کے کشادہ دامن ہمیں سمیٹے کو تیار تھے۔ لبیک اللھم لبیک کیا عجب منظر تھا۔ کیا عجیب راہیں تھیں۔ زندگی کن راہوں پر چل نکلی تھی۔ تکمیل کی منزلیں جو چند ساعتوں کے بعد نظروں کی حدوں میں سمانے والی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ جستجو کا پنچھی مسافتوں کی طوالتیں طے کرتا۔ منزلوں کا انعام پانے ہی والا تھا۔ یہی تو وہ داستان تھی جو ماضی کے لمحے لمحے پر چھائی ہوئی تھی۔ یہی تو وہ منظر تھا جو کبیدہ حیات کو کشیدہ کرنے کا سبب بنا تھا۔ یہی تو وہ ورد تھا جو مصیبتوں کے جہان میں وحی کی صورت نازل ہوا اور قلب کو دھوتا شوق کے الاؤ بھڑکا گیا۔ اور پھر داستان حیات کا ورق ورق اسی واردات قلب کی ستم آرائی کا مظہر تھا۔ خبر نہیں وہ اضطراب و ہیجان کے ساگر داخل کی دنیا میں کیسے سمائے رہے۔ نسیم سحر کے ٹھنڈے میٹھے جھونکے اور صحرا میں اترتی صبح کا مستانہ منظر سیاہیوں سے گلے ملتے ہوئے اجالے انہیں اپنے میں مدغم کرتے ہوئے ان پر چھائے جا رہے تھے۔ اور روشنیاں غالب آتی جا رہی تھیں۔ آنکھیں ان چاند ستارہ لمحوں کو اپنے اندر سمیٹے چمک رہی تھی۔ بسوں کی قطاریں، ٹیکسیوں کا ہجوم، لبیک لبیک یہی ورد، یہی نغمہ، یہی ترانہ، یہی حاضری کا سلام، یہی حقیقتوں کا پیغام ہر طرف ہر اور اوپر نیچے اندر باہر بکھرا ہوا پھیلا ہوا اور ان انسانی آوازوں کا ساتھ دیتے ہوئے میدان، پہاڑ، صحرا، زمین کتنے مکمل تھے با نصیب تھے۔ سورج بھی اسی روح پرور صدا کا ساتھ دینے کو نکل آیا تھا۔ ہر طرف ہر سو لبیک لبیک سب کچھ فنا ہو چکا تھا۔ کائنات اس صدا کے آگے سرنگوں ہو رہی تھی۔ کہیں بھی کچھ نہ رہا تھا۔ سب کچھ یہیں۔ سب کچھ اسی مرکز پر ان بولوں میں ان فضاؤں میں ان ہواؤں میں ہم میدان عرفات میں

پہنچ چکے تھے۔ دور دور تک خیموں کا جہان آباد تھا۔ ہمارے معلم کے خیمے سڑک کے نزدیک ہی تھے۔ اندر پہنچ کر ایک جگہ منتخب کی اور ہمارا گھر آباد ہو گیا۔ اس سفر عظیم میں بہت سے گھر بنائے بہت سے بسیرے ہوئے۔ بہت سے ٹھکانے میسر ہوئے جگہ جگہ گھر کہیں گھنٹوں کے گھر تو کہیں دنوں کے گھر کہیں ساعتوں کے گھر اور وہ سب گھر دنیا کے آباد ترین اور مکمل ترین گھر تھے نہ کوئی چوری کا فکر اور نا ہی قزاقوں کا ڈر نہ اسٹینڈرڈ کی فکر نہ دکھاووں کی الجھن نہ سامان تعیش کے جھگڑے نہ سجاوٹوں کے مسئلے کتنے حقیقی جذبوں سے آراستہ تھے ان گھروں کے درو دیوار انکے سینے کتنے کشادہ تھے ہر ایک کو سمیٹنے کو تیار، آنکھیں بچھائے، بازو پھیلائے، محبتوں سے مالا مال دامنوں والے گھر وہ گھر جو ہمارے نہ ہوتے ہوئے ہمارے اپنے تھے۔ اپنے بالکل اپنے جن کی محبتوں کے گداز ہمارے ارد گرد بکھرے تھے۔ میدان عرفات میں انسانوں کا عظیم اجتماع تھا۔ ہاتھوں میں دستی پنکھے، لبوں سے پانی کے گلاس، سورج اس دن شاید ان متوالوں کو آزمانے کے موڈ میں تھا۔ سروں پر کھڑا حوصلوں پر کمندیں پھینک رہا تھا وہ بے خبر جسموں کی حدود و قیود سے ماورا اس ارفع جذبے سے کب واقف تھا جو اس سفر عظیم کی سب سے بڑی دلیل تھا۔ اس دن دوپہر کا کھانا معلم کی جانب سے تھا۔ خیموں کے شروع میں داخلی دروازے کے نزدیک ہی ہماری دعوت کے انتظامات ہو رہے تھے۔ دوپہر کو ظہر کی نماز سے پہلے ہی گرم پلاؤ کے طباق آنے شروع ہو گئے لوگوں نے سیر ہو کر کھایا بزرگ حضرات جن کا زیادہ تر رجوع غسل خانوں کی طرف ہوتا ہے حسب معمول لوٹے ہاتھوں میں پکڑے آ جا رہے تھے۔ مشکل سے آ کر بیٹھتے کہ پھر جانے کی لگن لگ جاتی عرفات میں عارضی طور پر غسل خانے بنائے جاتے ہیں۔ ان عارضی غسل خانوں کے آگے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں زیادہ تر بزرگ حضرات کی تعداد ہوتی ہے۔ پسینے میں شرابور، احرام کی چادروں میں لپٹے ہوئے کمزور بدن ہاتھوں میں لوٹے پکڑے نحیف و نزار جسم۔ حج جو کہ اہم فریضہ ہے اس کی ادائیگی کے لئے بزرگ حضرت آ تو جاتے ہیں۔ مگر ان کے لیے فریضہ حج بہت دشوار ثابت ہوتا ہے۔ مجھے اس لمحے مدینہ شریف میں ملنے والے وہ بزرگ یاد آ رہے تھے جو کہ ہمارے ساتھ والے کمرے میں مقیم تھے وہ غالباً مدینہ شریف میں قیام کا دوسرا روز تھا۔ میں اپنے

کمرے میں جا رہی تھی کہ مجھے کسی نے پکارا۔ دھیئے، ذرا گل سن۔ میں رک گئی جی بابا جی کیا بات ہے۔ دھیئے۔ اک گل دا پتہ نہیں چل ریا وہ پریشانی سے بولے سفید بال، کمزور وجود، چہرے پر سن و سال کے گزرنے کی گہری لکیریں ہاتھ میں لوٹا، دھیئے۔ وہ بتاتے رک گئے پھر ذرا دیر کے بعد جھجک کر بولے میرے ساتھی روز مسجد میں جا کر نماز پڑھتے ہیں مگر جسمانی کمزوری کے باعث میں وہاں نہیں جا سکتا مگر مجھے یہاں یہ پتہ نہیں چل رہا کہ کس طرف منہ کر کے نماز پڑھنی ہے وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستگی سے یوں بولے جیسے خود سے بھی اس بات کو چھپانا چاہتے ہیں۔ میں ان کی بات سن کر حیرت اور صدمے سے گنگ رہ گئی یعنی آپ کو اب تک یہ علم نہ ہو سکا۔ کہ قبلہ کس طرف ہے۔ میں بے یقینی کی کیفیت میں انہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید میرے کانوں نے غلط سنا ہو۔ بھلا ایسا کیونکر ممکن ہے مگر اس بات کے صحیح ہونے کا اعتراف ان کا جھکا ہوا سر کر رہا تھا۔ آپ نے یہاں کسی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا بھی نہیں میں بے یقینی کی کیفیت میں ان سے پوچھ رہی تھی۔ دھیئے۔ سارے لوگ تو مسجد چلے جاتے ہیں۔ جو ایک آدھ مجھ جیسا بدنصیب رہ جاتا ہے وہ اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں تم ہی بتاؤ میں کسی کو کیسے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ وہ آہستگی سے بولے مگر بابا جی اگر آپ کسی کو نماز پڑھتے دیکھ نہ سکے تھے تو کسی سے پوچھ ہی لیتے۔ حیرت اور دکھ سے میری عجب کیفیت تھی اور ان بابا جی پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ جو ضعیف العمری میں اکیلے اس سفر عظیم پر نکلے تھے۔ کسی سے پوچھنے کی ہمت ہی نہ پڑی سب مجھ بوڑھے کا مذاق اڑاتے وہ بیچارگی سے بولے۔ واہ بابا جی۔ مذاق سے ڈر گئے اور یہ نہ سوچا کہ اتنے مقدس مقام پر عبادتوں کی سعادت سے محرومی کتنی بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیسے اس کیفیت کا اظہار کروں جو مجھے کھولا رہی تھی۔ آپ کے ساتھ گھر سے آنے والا کوئی نہ تھا جو آپ اکیلے اس عمر میں حج پر نکلے۔ مجھے باوجود کوشش کے لفظ نہ مل رہے تھے کہ ان بزرگ کو کیسے بے خبری کے نقصان سے آگاہ کروں۔ اوہ گل اے وے دھیئے کہ میرا پتر اتھے سعودی عرب وچ ملازم اے۔ اوس نے ڈرافٹ بھیجیا سی مینوں حج واسطے پر اونوں آپ حج دی اجازت نہ ملی، کیونکہ اوس نے پہلے ای حج کیتا ہویا سی۔ ایس لئی میں گروپ دے نال آیا واں۔ انہوں نے اپنے

اکیلے آنے کی وضاحت کی۔ میں ان کی وضاحت پر خاموش ہو گئی۔ حالانکہ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ زیارت حرمین شریف کے لیے ترسنا ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر بعض اوقات حالات کی سنگینیاں، مالی کمزوریاں اور دیگر دنیاوی مسئلے کچھ یوں جکڑتے ہیں کہ انسان چاہتے ہوئے بھی اپنی یہ آرزو پوری نہیں کر سکتا اور جب حالات اور وسائل اجازت دیتے ہیں تو اتنی دیر ہو چکی ہوتی ہے کہ ضعیفی اپنے مسئلے اپنی سنگینیاں کھڑی کر دیتی ہے اور پھر جرم ضعیفی کی سزائیں کچھ یوں حملہ آور ہوتی ہیں کہ انسان ان بابا جی والی صورتحال کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھے ان بزرگ سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو اپنے تمام جرم کے باوجود بھی مجرم نہ تھے۔ اصل مجرم تو وہ حالات تھے جو انہیں عمر کے اس دور میں ان جگہوں تک لے آئے جب وہ بالکل بے دست و پا ہو چکے تھے۔ خیر میں ان سے کیا کہتی انہیں ان کی مشکل کا حل بتایا اور میں کمرے میں آ گئی۔ میدان عرفات میں ان جیسے لا تعداد بزرگ دیکھے جو ضعیفی کے بوجھ تلے دبے ہانپتے کانپتے چلتے پھر رہے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ سب لوگ اس کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ وقوف عرفات شروع ہو چکا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں اس مالک کے آگے جھکا ہوا تھا۔ سب کے مانگنے کے انداز جدا، طریقے جدا، خواہشیں جدا —— مگر درد ایک تھا معبود ایک تھا۔ جس کے آگے جھکے ہوئے سر اس کی بندگی کا اقرار کر رہے تھے۔ میدان حشر میں روز محشر کے خوف سے لرزتے بدن ڈبڈباتی آنکھیں، چھلکتے جذبات اعتراف گناہ اور عفو کی التجائیں مصلحتیں، دنیا داریاں، قصہ پارینہ بن چکی تھیں۔ وہاں تو شرمندگیوں کے مارے ہوئے بے بس انسان تھے۔ گناہوں کے طوق گلے میں اور ندامتوں کے پسینے میں نہائے بخشش کے امیدوار انسان، اس لمحے زندگی کتنی فضول کتنی غیر اہم ہو گئی تھی۔ کل اور آج میں کتنا فرق تھا۔ کل کی خوبصورتیاں آج بھیانک بدصورتیوں میں بدل چکی تھیں۔ کل کے نغمہ ہائے زندگی آج توبہ کی کراہوں میں بدل چکے تھے۔ کل کتنا حسین تھا۔ مگر اس کے دامن میں بے ثباتی و نامرادی کے کتنے کانٹے تھے۔ کانٹے جو کل کی راہوں میں بچھے آج کے تلووں میں چبھ رہے تھے۔ جن سے پاؤں زخمی زخمی قبائے زیست تار تار تھی وہ دور جو گزرے کل کی پیداوار تھا کبھی کتنا دلربا تھا مگر آج اس کی دلربائی کے انداز کس قدر

قاتلانہ تھے۔ پشیمانی، جرم گناہ، جرم بے وفائی، جرم بے اعتباری میں اپنے جھکے ہوئے پشیمان سر کو زمین عرفات سے لگائے اس معبود سے بخشش کی طلبگار تھی عذاب زیست کے لمحے میرے گناہوں کی صورت چمٹے میرا لہو نچوڑ رہے تھے۔ زندگی کا رس ہولے ہولے نچڑ رہا تھا۔ زندگی پانی کی صورت بہہ رہی تھی جان عذابوں کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ جسم کے پنجرے میں جنموں سے قید روح زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑا رہی تھی —— سولی پر لٹکتے جسم کی جان آنکھوں میں آ کر اٹک گئی تھی۔ آنکھیں جو ٹوٹ رہی تھیں۔ اس بوجھ سے دم توڑ رہی تھیں کراہ رہی تھیں۔ مگر اس عذاب سے نجات پانا شاید ان بدنصیبوں کے اختیار میں نہ تھا بیتے لمحوں کے خسارے تن میں انگاروں کی طرح اترے جا رہے تھے جسم سیخ پر لگے کباب کی طرح ہولے ہولے جل رہا تھا۔ میدان حشر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ روح میں اتر چکا تھا عذاب و ثواب کی زنجیروں میں جکڑا جسم اس لمحے بڑا بے بس ولاچار تھا۔ نہ تو آگے کوئی جائے پناہ تھی نہ ہی پیچھے کوئی محفوظ مقام۔ اس زندگی اور اس کی لامحدود خواہشوں نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اپنا سب کچھ اسے دان کر دینے کے باوجود بھی کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ سوائے پچھتاوؤں کے۔ پچھتاوے جو کسی بھی غلط عمل کے بعد باقی بچ جانے والی چیز ہوتے ہیں۔ ہر لمحہ ہر گھڑی ساتھ ساتھ ایک اچھے دشمن کی طرح تعاقب میں لگے رہنے والے لمحے لمحے کے محاسب پل پل کے راز دان انہی پچھتاوؤں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے جب وقت گزر گیا تو حال کی روشن راہوں پر قدم جا پڑے حال کی زندگی اپنے کمال پر پہنچ چکی تھی چاہے کچھ بھی نہ ملے جنت نہ ملے دنیا کے سکھ نہ ملیں۔ خواہشوں کے جہاں نہ ملیں، آرزوؤں کے شبستان نہ ملیں تو کچھ غم نہیں کہ اس مہربان کی مہربانیوں کی طفیل یہ لمحے، یہ زمین، یہ مقام تو مل گیا۔ اس مہربان اور اپنے درمیان ایک ربط خاص کا عرفان تو پا لیا اور کیا چاہیے گناہوں کی زنجیریں کڑی سہی، عذابوں کے سیاہ خانے خوفناک سہی، مگر جسم و جان کے وہ سکھ جو سر زمین حجاز پر ملے اتنے بے بہا تھے کہ سب کچھ اس میں دب کر رہ گیا۔ اب چاہے دوزخ کی سزائیں ملیں۔ اپنا دامن تو ان رنگوں سے اتنا بھر گیا تھا کہ کسی بھی شے سے متاثر نہ ہو سکتا تھا زندگی تکمیل کی ان منزلوں پر کھڑی تھی جہاں عذاب دگناہ کے تمام مرحلے ایک کھیل معلوم ہو رہے تھے

اور کیا چاہیے اور کیا پانا تھا وہاں تو ظرف سے زیادہ مل گیا تھا۔ زندگی کانٹوں پر گھسٹتی گھسٹتی آخر کار منزل مراد تک پہنچ گئی تھی ایک بھیگی بھیگی آواز کانوں سے ٹکرائی یا اللہ ہمارے قدم کبھی نہ ڈگمگائیں اے اللہ ہمیں ثابت قدم رکھیو میں نے آواز کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں تو سامنے آنٹی کو پایا جو آنکھیں بند کیے ہاتھ اٹھائے نفس کی متلون مزاجی سے خائف اس کی راستی کے لیے دعا گو تھیں۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف وہی سلسلے تھے وہی منظر تھے لوگ مانگ رہے تھے اعتراف گناہ کر رہے تھے۔ مجرموں کی طرح اس بڑی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے اس سے بخشش کے طلبگار تھے۔ گزرے لمحوں کی ستم آرائی کے قصے چھڑے تھے بیتی گھڑیوں کی بزم آرائی سے پشیمان تھے۔ جاگتی دنیا کی چکا چوند میں اپنے اصل کو بھولنے والے مقام اصل پر پسینے میں نہائے اپنے آپ سے نظریں چرا رہے تھے۔ دھیمی رفتار سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا سورج اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ دھوپ کی شدتیں مدھم پڑ گئی تھیں خیموں کی بستی میں زندگی حرکت کر رہی تھی۔ کوچ کا وقت قریب آ رہا تھا۔ لوگ اپنا مختصر اسباب اٹھائے بسوں کے قریب جمع ہو رہے تھے شام آہستہ خرامی کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہی تھی معلم نے رخصتی دعا شروع کر دی لوگ ساکت نظریں جھکائے کھڑے رخصتی بولوں کو سن رہے تھے۔ معلم کی دعاؤں کے بول کوشش کے باوجود پلے نہ پڑے۔ ایک تو عربی زبان ناقابل فہم تھی۔ دوسرا اس کے بولنے کا انداز بالکل سبق پڑھنے کا سا تھا۔ رٹا رٹایا کسی بھی تاثر سے خالی میں اس مجمع سے نکل آئی جو معلم کے پاس جمع تھا۔ تھوڑا ہی چلی تھی کہ مجھے رکنا پڑا ایک آواز نے میرے بڑھتے قدموں کو جام کر دیا۔ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا وہ سب کچھ حاصل کر کے جاؤں گا۔ جس کی مجھے ضرورت ہے۔ اب منہ موڑ کر کدھر جاؤ گے سائل تو دروازے تک آن پہنچا کیا اس بے بس کو خالی ہاتھ لوٹا دو گے کیا اس کی نامرادی کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے کیا ابھی اور عذاب باقی ہے اگر ایسا ہے تو تیرے در سے واپس نہیں جاؤں گا۔ یہیں مٹ جاؤں گا اب اور اذیتیں برداشت نہیں ہوتیں جانے اس آواز میں کیا سوز تھا۔ میں بے اختیار اس کی سمت کھنچتی چلی گئی بسوں کی قطاروں کے اندر کھوجتی ڈھونڈتی اس اللہ کے روٹھے ہوئے بندے تک جا پہنچی جو اس سے مانگتے ہوئے اس

کے بہت قریب چلا گیا تھا۔ اسکی آواز میں درد تھا۔ آنکھیں بند تھیں بہتے آنسو اس کی چھوٹی سی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے میدان حشر میں شام اتر آئی تھی۔ اب مجھ سے منہ نہ موڑنا اب مجھ سے نظریں نہ پھیرنا۔ میرے اللہ میری مشکلوں پر تو نظر رکھ۔ تو جانتا ہے میں کن کن عذابوں سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں تو دیکھ لینا میں واپس نہیں جاؤں گا۔ یہیں سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا۔ پھر نہ کہنا مجھ سے مانگا کیوں نہیں تھا۔ اگر میری ضرورت ہے تو مجھے بچا لے مجھے بھر دے مجھے وہ سب کچھ دے دے، جو میں تجھ سے مانگ رہا ہوں۔ اگر تو مجھے کچھ نہ دے سکا تو میں تجھے یہ زندگی لوٹا دوں گا جانے وہ کن دکھوں کا مارا تھا۔ پتہ نہیں وہ کن حالات کا ڈسا ہوا تھا کہ آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا وہ جوش جنوں میں بس پر کے برسا رہا تھا۔ سر ٹکرا رہا تھا۔ دینے والے سے مانگنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں کئی انداز ہوتے ہیں۔ دعائیں تو عرضیاں ہوتی ہیں جو ہم اپنے مالک کو جذبوں کے لفافوں میں بند کر کے ہواؤں کی ڈاک میں بھیج دیتے ہیں۔ ان عرضیوں کی بہت سی رسمیں، بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ بعض طریقے بڑے اہتمام سے کئے جاتے ہیں۔ وضو، مصلیٰ، نمازیں، مسجدیں مگر بعض عرضیاں ان اہتماموں سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔ دل سے نکلنے والی اور براہ راست اللہ کے حضور پیش کرنے والی۔ وہ عرضی اس شام میدان عرفات میں دیکھنے کو ملی۔ اس کے انداز ہی جدا طور ہی نرالے تھے۔ کسی بھی قسم کے تکلفات سے مبرا، رسموں سے بے نیاز اس مالک سے قربت کا ایک انوکھا ہی ربط دیکھنے کو ملا جانے وہ کونسی منزل تھی کہ وہ اپنے آپ سے نکلا جا رہا تھا۔ اس کی دعاؤں میں ہم سب کی دعائیں شامل ہو گئیں۔ اس کے لبوں سے جیسے ہم سب کی آرزوئیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہم سب شریک دعا ہو گئے عرض حال کہہ رہے تھے۔ دکھڑے بیان کر رہے تھے۔ اس کی آواز میں بہت سی آوازیں شامل ہو گئیں۔ آواز دلوں سے نکلی ہوئی لمحوں کی گرفت سے آزاد فضاؤں میں بکھر کر آسمانوں تک پہنچنے والی ہم سب ایک تھے۔ عرضیاں ایک تھیں، دکھ مشترک تھے ہم جدا تو نہیں تھے، کب جدا تھے بھلا۔ ہم سب تو ان بولوں میں سمٹ آئے تھے جو اس طلبگار کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے بول جو اس آسمانوں کے مالک کو رگ جان سے بھی قریب محسوس کرنے کے تھے بول جو حقیقتوں کی تلخیوں کا اظہار

تھے شام کا سورج اس اثنا میں ڈوب چکا تھا۔ ہم بس میں بیٹھے مزولفہ جا رہے تھے مزولفہ میں رات کھلے آسمان تلے تھی۔ پابندی کی رسم سے آزاد رات ہم قدرے نشیبی میدان میں اپنا گھر بسائے بیٹھے تھے دودھ ' ڈبل روٹی ' جیم و فروٹ وغیرہ پاس تھے۔ سب نے تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت کھالیا پھر کنکریوں کی تلاش شروع ہو گئی زمین میں دبی ہوئی کنکریاں ہمارے وہ ہتھیار جو ہم اپنے ازلی دشمن پر آزمانے کی خاطر اکٹھے کر رہے تھے۔ ہمارا دشمن جو ہمیں عمر کے لمحے لمحے میں بھٹکاتا ہے اسے ستانے کا پریشان کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آ رہا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہم اپنے ضروری سامان سے لیس ہو رہے تھے رات گئے تک اسلحہ کی تلاش جاری رہی اور پھر اپنے اپنے ہتھیاروں کو بحفاظت رکھ کر ہم لیٹ گئے۔ تاروں کی چھاؤں ہلکی ہلکی ہوا کا ترنم' آس پاس ملی جلی آوازوں کا شور اور جسم کی تھکاوٹ نے جلد ہی بے خبر کر ڈالا صبح جلد ہی ہم منیٰ پہنچ گئے وہ دن کافی مصروف دن تھا۔ شیطان سے نمٹنے کے بعد قربانی اور پھر احرام کھولنے کا کام باقی تھا۔ ہم سب نے اپنی اپنی قربانیاں حکومت کے قائم کردہ ایک بینک کے توسط سے دیں جو کہ قربانی کے گوشت کو صحیح استعمال میں لانے اور حجاج کی سہولت کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ہماری دی ہوئی قربانیاں ایتھوپین اور افغان پناہ گزینوں کو پہنچائی جانی تھیں۔ ہمیں دن کے گیارہ بجے بتا دیا گیا کہ قربانیاں ہو گئی ہیں۔ آپ لوگ احرام کھول لیں۔ ہم لوگ یہ خبر سنتے ہی خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے غسل خانوں کی طرف لپکے۔ منیٰ کے ٹھنڈے پانی اور کھلی چھتوں والے غسل خانے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یخ پانی اور فرائض کی بجا آوری کے احساس نے جسم کو پرسکون بنا دیا۔ غسل کے بعد خیمے میں آئی تو انکل کو قربانی دینے کے واسطے جانے کے لیے تیار پایا۔ آنٹی احرام باندھے بیٹھی تھیں۔ انکل آتے ہوئے تھوڑا سا گوشت لیتے آئیں میں نے کہا۔ ضرور بیٹے۔ انکل بولے۔ سنئے ذرا جلدی آیئے گا۔ کیونکہ آپ کے آنے کے بعد ہی احرام کھول سکوں گی۔ آنٹی نے پیچھے سے آواز دی اچھا اچھا نیک بخت ابھی تو جانے دو۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ جایئے جایئے ہم نے روکا تو نہیں۔ اری نیک بخت اگر روکو گی تو رک جائیں گے۔ ذرا ایک بار روکو تو سہی۔ انکل انہیں چھیڑتے ہوئے بولے۔ انکل و آنٹی کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ توبہ

ہے یہاں تو بات کر کے بندہ پھنس جاتا ہے آنٹی جھینپتے ہوئی بولیں تو ہم سب ہنس پڑے۔ ہمارے آس پاس کے خیموں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ لوگ قربانی سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے۔ گوشت ہر سمت نظر آتا تھا۔ اسے پکانے کے انتظامات میں سب لگے ہوئے تھے۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے انکل کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انکل تو ابھی تک نہیں آئے ہو سکتا ہے وہ زیادہ دیر تک لوٹیں اس وقت تک تو بھوکے بیٹھنا بہت مشکل ہے تو پھر کیا کیا جائے باجی کی بات سن کر میرا بھی خالی پیٹ احتجاج کرنے لگا۔ خود ہی کوئی انتظام کرنا ہوگا۔ باجی بولیں مثلاً کیا انتظام یہاں تو سوائے فروٹ دودھ کے اور کچھ نہیں ملے گا میں نے گوشت کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت حقیقتاً گوشت کے علاوہ دل کسی اور چیز کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا۔ پچھلے دو دن سے ڈبل روٹی جیم فروٹ کھا کھا کر جی اکتا سا گیا تھا۔ اس وقت تو زبان کسی چٹخارہ دار چیز کی منتظر تھی۔ انتظام یہ کہ کسی ہمسائے سے گوشت مانگ لیتے ہیں۔ یوں بیٹھنے سے تو کچھ نہ ہو گا وہ بولیں۔ ہیں! کیا کہا یعنی مانگ کر گوشت پکایا جائے' میں حیرت سے بولی۔ تو اور کیا آسمانوں سے گوشت اترے گا ہمارے لیے' وہ جل کر بولیں۔ جاؤ شاباش میری بہن ہمت کرو وہ مجھے سمجھاتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ نہیں باجی یہ مانگنے والا کام آپ کا۔ پکانے والا میرا' میں مانگ نہیں سکوں گی۔ کیوں کیا تکلیف ہے تجھے وہ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔ یہاں سے کچھ مانگتے ہوئے شرم کیسی یہاں تو ہم سب برابر ہیں وہ تمام دکھاوے وہ ظاہری آن بان ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں جھجک کیسی۔ یہاں تو ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی ایک دوسرے کے غمگسار ہیں۔ یہاں یہ رسمیں یہ باتیں فضول لگتی ہیں وہ بولیں آپ کی تمام باتیں ٹھیک ہیں۔ مگر آپ کو تو باجی معلوم ہے میں مانگ نہیں سکتی۔ کسی سے بھی کچھ مانگتے وقت میری زبان میرا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ جیسے کٹ جاتی ہے۔ میں چاہوں بھی تو بول نہیں سکتی۔ میں شرمندگی سے بولی۔ ایک تو تمہاری ان غیرتوں نے بڑا تنگ کر رکھا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتی ہو وہ بڑبڑاتے ہوئے بولیں اور ذرا سی دیر میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر لوٹیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ عید قربان پر گوشت کے بڑے بڑے بھرے ہوئے ٹبوں کے پاس بیٹھ کر گوشت بانٹنے والی باجی ثریا ارض مقدس میں

پاؤ بھر گوشت مانگتے ہوئے ذرا بھر نہ شرمائیں۔ شاید اس انوکھے مستانے دیس کی محبتیں تھیں۔ جنہوں نے تمام مصنوعیت اتار کر رکھ دی تھی۔ ظاہری رکھ رکھاؤ اور شان و شوکت کے پرت اترے تو اندر سے حقیقتوں کے دلکش پیکر نکلے وہ پیکر جو جھوٹے تکلفات میں کہیں ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ ہم کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا سامنے سے انکل آ رہے ہیں خون میں ڈوبا ہوا جسم' ننگے پاؤں تھکے تھکے قدم' پسینے میں نہائے ہوئے' انہیں اس حال میں دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ انکل خیریت میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ بیٹا جلدی سے پانی دو۔ میں نے انہیں ٹھنڈے پانی کا گلاس تھما دیا۔ پانی پینے کے بعد لمبی سانس لیتے ہوئے بولے۔ اتنی مشکل سے قربانی ہوئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ کوشش کے باوجود گوشت نہیں لا سکا۔ بس یوں سمجھو کہ جان باقی تھی جو بچ گیا۔ ورنہ وہاں مرنے میں بہت تھوڑی کسر رہ گئی تھی۔ ان کی حالت ان کے لفظوں کی گواہ تھی۔ کوئی بات نہیں انکل ہم باجی کی کوششوں سے بڑا مزیدار کھانا کھا چکے ہیں۔ آیئے آپ بھی کھایئے۔ میں نے چور نظروں سے باجی کی طرف دیکھا وہ مجھے چڑانے کے انداز میں ہنس رہی تھیں۔ منیٰ کے دن یونہی خواب میں گزر گئے طواف زیارت کے بعد مزید دو دن ہم وہاں رکے اور بارہ ذوالحج کی سہ پہر کو واپس مکہ پہنچے۔ دن کتنی جلدی پل ہی پل میں بیت گئے وہ دن جن کو پانے کے شوق زندگی کا حاصل تھے۔ مگر وہ لمحے وہ گھڑیاں کتنی مختصر تھیں۔ کتنی کم تھیں کہ جب انہیں پایا تو وقت جیسے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ جسم فقط تماشائی بن کر رہ گیا۔ دنوں کی آنکھ مچولی کو دیکھتا محسوس کرتا مگر بے اختیار کچھ نہ کر سکنے والا تماشائی وہ تماشائی جس کا کام صرف کھیل دیکھنا ہوتا ہے۔ کھیل میں کتنے نشیب و فراز ہوتے ہیں کتنے دشوار لمحے آتے ہیں۔ ان سے باخبر مگر دخل اندازی نہ کر سکنے والا بے بس و بے دست و پا تماشائی۔

***

اب تو جاگ مسافر پیارے
رین گئی لٹکے سب تارے

مکہ کی ہوائیں جسم کو چھو چھو کر گزر رہی تھی۔ ان فضاؤں میں بہت سے روشن لمحے ہاتھوں کی دسترس میں آئے تھے اور رنگ برنگ تتلیوں کی طرح رنگ بکھیرتے اڑ چکے تھے۔ ہاتھ ان خوبصورتیوں کو محسوس کر رہے تھے۔ مگر پا نہیں سکتے تھے وہ بچھڑتی جدا ہوتی خوبصورتیاں تنگ کر رہی تھیں۔ پریشان کر رہی تھیں۔ جب تک کسی چیز کو دیکھا نہیں ہوتا سن کر اس کے بارے میں اشتیاق ہوتا ہے اس کو دیکھنے کی خواہش جنم لیتی ہے۔ اس کو دیکھ کر محسوس کرنے کی آرزوئیں ستاتی رہتی ہیں اور جب اس پر اشتیاق شے کو دیکھ لیا جائے تو اسے پانے کی آرزوئیں پلنے لگتی۔ اس سے قربت کی تمنائیں زندگی کو چھیڑنے لگتی ہیں۔ کچھ عجیب رنگ تھے اس کیفیت کے جو ان قریب الختم لمحوں کی پیداوار تھی۔ ہم سب حرم شریف میں داخل ہو چکے تھے۔ قدم اس مرکز کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جہاں دوام تھا، قرار تھا، حیات تھی، ہم چل رہے تھے۔ مگر فاصلے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ مرکز دور ہوتا جا رہا تھا۔ شوق جسم کو کھینچے چلا جا رہا تھا اور دوریاں حائل ہوتی جا رہی تھیں۔ گو مرکز نگاہوں کی دسترس میں تھا۔ مگر جسم کی رسائی سے بہت دور تھا۔ فاصلے ہی فاصلے ہر سمت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ کیا ہو گیا ہے پہلے تو فاصلے اتنے نہ تھے اب بڑھ کیوں گئے۔ چلتے چلتے پاؤں ٹوٹ رہے ہیں۔ نظریں دھائی دے رہی ہیں ملن کی۔ یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ اتنی تڑپ کے باوجود رسائیوں کی منزل نہیں مل رہی۔ مرکز تک پہنچنے والے راستے اس سے پہلے تو اتنے طویل نہ تھے۔ اب کیا ہو گیا اے پروردگار عالم مجھے مت آزما مجھے اتنا نہ ترسا کہ میں مر جاؤں مجھے قربتوں میں اتنی دوریاں نہ بخش کہ میں بھٹکتی ہی رہ جاؤں فاصلے ختم کر میرے مالک

مجھے قربتیں بخش۔ اللہ کے بڑے گھر اور میرے درمیان انسانوں کا ایک سمندر حائل تھا۔ جس کی لہریں مجھے ادھر سے ادھر پٹخ رہی تھیں۔ جدائیوں کے بادل سر پر چھتر چھاؤں کئے مجھے اپنی نمی میں بھگو رہے تھے۔ اوپر بہت اوپر کھڑا بڑے گھر کا مالک انسانوں کے اس متلاطم سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ لبیک اللھم لبیک ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی جو لاکھوں لبوں سے لبیک کی صورت نکل کر زمین و آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پھیل رہی تھی بکھر رہی تھی۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی تو ایک محبت بھری آسودہ مسکراہٹ اس کے مہربان چہرے پر پائی۔ جیسے وہ بہت خوش ہو بہت مطمئن ہو۔ لبیک کے نور میں گھرا وہ مہربان چہرہ چمک رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ میرے قدم جیسے زمین پر جم کر رہ گئے۔ گرد و پیش سے بے خبر میں اوپر بہت دور تک دیکھ رہی تھی۔ اللہ اللہ ہر طرف ہر سمت، ہر طور، اوپر نیچے، اندر باہر، زمین آسمان ہر دل میں ہر دماغ روح میں دھڑکنوں میں، جسم کے ریشے ریشے میں رگ رگ میں وہی ہے اول، وہی آخر وہی، ظاہر وہی باطن وہی حقیقت وہی سچائی وہی روشنی وہی نور وہی قرار وہی اللہ تو ہی تو ہر گھڑی ہر لمحے میں قائم و جاوداں ہے۔ تجھ سے ہی ابدیت تجھ سے ہی آخرت ایک دھکا سا لگا۔ میں نے گرتے گرتے بے اختیار اوپر کی طرف دیکھا۔ میری نظروں کی حدوں میں نیلے آسمان کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو آسمانوں پر تھا وہاں سے اتر کر میری شہ رگ میں بس گیا تھا۔ سانسیں، ہر طرف اس کی موجودگی کا اعتراف کر رہی تھیں۔ وجود اس کی عظمت کا بین ثبوت تھے۔ اس شام انکل اور آنٹی ہم سے جدا ہو چکے تھے۔ جن انجانی راہوں پر چلتے ہوئے اتفاقاً ہم سے آن ملے تھے انہیں راہوں پر ہم سے جدا ہو چکے تھے غیر معینہ مدت کے لئے۔ ہم جو چلتے چلتے پل بھر کو اکٹھے ہو گئے تھے۔ پھر سے اپنی اپنی راہوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اس شام کی شب بہت طویل بہت تاریک تھی۔ وہ شب جو شہر مکہ میں آخری تھی، اپنے جلو میں ہجرت کے اندوہ لے کر آئی تھی۔ جس کے اندھیرے ملن کی روشنیوں پر چھا رہے تھے۔ اے شہر مکہ تیرے پیار کرنے والوں کے نصیب میں ہجرتیں ہی کیوں لکھی ہوتی ہیں؟ تیری قربت کے شیدائیوں کے حصے میں دوریاں ہی کیوں ہوتی ہیں؟ بتا تو آنے والے مسافروں کو جدائیوں کی سوغاتیں ہی کیوں

بخشا رہتا ہے؟ دربدری ہی کیوں سونپتا رہتا ہے۔ بتا تیرے لیے ترسنے والے کہاں جائیں۔ بتا وصل کی امید میں آنے والوں کے دامن تو فراق کے کانٹوں سے کیوں بھر دیتا ہے بتا تو اتنا بے درد کیوں ہے؟ دکھا دے اپنے چاہنے والوں کو کوئی اور جہاں کوئی اور مکہ۔ کوئی اور کعبہ۔ جہاں جا کے وہ جدائیوں کے کانٹوں سے دامن چھڑا لیں۔ مگر تو بھی جانتا ہے تو واحد ہے تجھ جیسا سارے جہاں میں اور کوئی نہیں۔ اور شاید اسی لیے اتنی بے اعتنائی برتتا ہے، اپنے پرستاروں سے۔ مانا تجھے ہماری ضرورت نہیں مگر ہم اپنے جسم و جان کی ضرورتوں کو لے کر کدھر جائیں، کہ اندھی آنکھوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کدھر جائیں کہ روشنیاں تجھ ہی سے جنم لیتی ہیں اور تجھ پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ تمام رات یادوں کے نگار خانوں میں آئینے تراشتے بیت گئی۔ تمام شب لمحے رنگ برنگے جگنوؤں کی طرح دل کے سیاہ خانے میں ٹمٹماتے رہے۔ روشنی کرنے کے جتن کرتے رہے۔ مگر دل ناصبور میں تو جدائیوں کے پنچھی پنکھ بکھیرے بے دم پڑے تھے۔ وہاں روشنیاں کیسے جاگتیں۔ زندگی پھر وہیں لوٹنے والی تھی، جہاں سے دامن چھڑا کر ادھر پناہ کے لیے بھاگی تھی۔ شاید یہ بھول گئی تھی کہ عشق ہمہ دم ایک امتحان ہے۔ عشق جدائیوں کے مرحلوں کا ہی نام ہے۔ عشق کرنے والے کبھی ٹھکانے نہیں بناتے بسیرے نہیں کرتے وہ تو ہمہ دم پارے کی طرح مضطرب رہتے ہیں۔ ایک سے دوسری جگہ پڑاؤ کرتے، منزلوں کی کھوج میں سرگرداں، مگر منزل تک تو پہنچ گئے تھے۔ عشق کی اداس آنکھوں میں آنسو ہی آنسو نظر آئے، ٹھکانہ تو مل گیا تھا پھر یہ جانا کیسا۔ اس کی بات شدت کرب سے ادھوری رہ گئی۔ شاید یہ بھی ایک امتحان ہے ایسا امتحان جو محبوب سے دوری کی آزمائشوں کی شرط پیش کرتا ہے اور شاید ان کٹھن شرائط کو نبھانا ہی عشق کی انتہا ہے۔ عقل ہمیشہ سے ناصح کا کام سرانجام دیتی تھی اس لمحہ بھی بول پڑی کہیں ان شرائط کو نبھاتے نبھاتے آزمائشیں جان نہ لے لیں۔ عشق کے دکھڑے جاری تھے۔ نہیں سچے عشق کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بہت بہادر بنا دیتا ہے۔ یہ حوصلوں کو مضبوطی بخشتا ہے اور حوصلے مرنے نہیں دیتے کہیں سے آواز آئی۔ تمام شب انہی سوالوں اور جوابوں میں بیت گئی صبح جو اپنے چمکیلے اجلے دامن میں آنے والے بے شمار بچھڑے لمحوں کے پیام لائی تھی۔ شہر اول و آخر میں

ملنے والی آخری صبح اداس اداس تھی۔ فضائیں چپ چپ۔ ہوائیں خاموش خاموش۔ سڑکیں جیسے میرے قدموں سے گلے مل مل کر میرے ساتھ رو رہی تھیں۔ وہ بازار جس میں بارہا آنا جانا ہوا۔ جو میرے وجود سے آشنا تھا۔ مجھے الوداعی نظروں سے تک رہا تھا۔ وہ پل جس کے نیچے سے گزرتے ہوئے ہم پل بھر کو تھکن اتارا کرتے تھے اس کے نیچے پہنچ کر قدم رک گئے۔ اس کی چھایا ہمیشہ میرے تپتے وجود کو سکون بخشتی تھی۔ اس کے مہربان سائے نے ہمیشہ سورج کی جلن سے پناہ بخشی تھی۔ مگر آج میرے ساتھ وہ خود بھی جل رہا تھا۔ میرا غمگسار میرا دوست مجھے الوداع کہتے ہوئے بے قرار سا تھا۔ اس کی پناہیں مجھ سے دور ہو رہی تھیں مگر ان پناہوں کا حسن دل کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ اس لمحے اس کی ٹھنڈی میٹھی چھایا سمٹ کر میرے اندر اتر آئی تھی اور اس نے میرے وجود میں پھیل کر مجھے سمیٹ لیا تھا۔ کعبتہ اللہ نظروں کے سامنے تھا۔ بہت سی ساعتیں اس سے قربتوں کی امین تھیں۔ مگر خبر نہیں وہ کیسی تشنگی تھی جو کہ روز اول سے جوں کی توں تھی وہ تشنگی ان قربتوں کے لمحوں کے بعد مزید بڑھ گئی تھی اور اس تشنگی کا دوزخ جل رہا تھا۔ رخصت کے کٹھن مرحلے شروع ہو چکے تھے۔ رخصت کی سنگینی اپنی تمام تر حقیقت کے ساتھ نظروں کے سامنے تھی۔ مگر دل بے بس کی آشفتہ حالی عروج پر تھی۔ کوئی گوشہ کوئی جائے پناہ مل جائے جس میں چھپ کر جدائیوں کی تیز نگاہوں سے اوجھل ہوا جا سکے۔ بھیگتی آنکھیں دور دور تک محفوظ مقام کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ جہاں روپوش ہو کر ان بے درد لمحوں کی دکھن سے بچا جا سکے جو سر پر وارد ہوئے تھے۔ کوئی ایسا گوشہ میرے معبود جو پناہ گاہ بن سکے۔ ان ظالم اندھیروں سے بچا جا سکے جو زیست پر پھانے کے لیے آ رہے ہیں۔ میں مرتے مرتے بھی زیست کی امید میں جی رہی تھی مگر تقدیریں بڑی ظالم اٹل اور بڑی بے رحم ہوتی ہیں۔ کبھی نہ ٹلنے والی کسی التجا کا اثر قبول نہ کرنے والی وہ بھلا کیسے بدل سکتی تھیں وہ تو ازل سے لوح محفوظ پر رقم ہو چکی تھیں میری التجاؤں پر وہ بڑی بے رحمی سے مسکرا رہی تھیں۔ میں دیوانی اللہ کے بڑے گھر کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ طواف وداع شروع تھا۔ وداع کی رسمیں جاگ اٹھیں تھیں تمنائیں داخل کی دنیا میں واویلا مچاتی رہ گئیں۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ سب کچھ حسب

معمول تھا۔ مجھ میں ہی ساری خرابیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ سارے عذاب جاگ اٹھے تھے جدائیوں کی زہرناکی جسم کے پور پور میں دوڑ رہی تھی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ تن کی ساری جان سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھی۔ ہائے مشکل کہ جسم واپسی پر آمادہ ہی نہ تھا۔ شوق کہ قدم جانے پر مجبور تھے۔ مجبوریاں کہ جسم کو پا بہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔ قسمتیں کہ بڑی قاتل بے وفا تھیں۔ محبتیں کہ زیست کا سب سے بڑا ارمان بن گئی تھیں۔ حسرتیں کہ تشنگی کا صحرا بن گئیں تھیں۔ معصیتیں کہ زندگی کی پہچان بن گئی تھیں۔ طلب کہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکنے کا ملال تھا۔ آرزوئیں کہ دوریوں میں مدغم ہو رہی تھیں۔ دیوانگی کہ فرزانگی کو گلے لگا رہی تھی۔ بے بسی کہ شام جدائی اتر آئی تھی۔ اس وداعی لمحے لفظ بے وجود ہو چکے تھے۔ دعاؤں کے لبوں پر قفل پڑے تھے۔ شاید جذبوں کی کمیابی ہی جدائی کا سامان بن گئی۔ ارادے کی کجی دوریوں کا سبب بن گئی۔ بھلا کہاں میں درداں ماری اور کہاں پناہ کی تمنائیں۔ ساری عمر کے بسیرے کی آرزوئیں۔ درون خانہ اک شور سا بپا تھا۔ آگ لگا دینے والا، خاکستر کر دینے والا سب کچھ تباہ کر دینے والا، اندر ایک سمندر متلاطم تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا چنگھاڑتا ہوا، گرجتا ہوا، غرقاب کرتا ہوا، طواف وداع مکمل ہو چکا تھا۔ آخری طواف بھی ختم ہو گیا تھا۔ خانہ کعبہ کے سیاہ غلاف سے لپٹی بازو پھیلائے کھڑی تھی۔ جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ آنکھیں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں یوں لگ رہا تھا کہ اس مقام کو چھوڑنے کے بعد کچھ بھی نہ رہے گا۔ دنیا مٹ جائے گی۔ باہر قدم رکھتے ہی قیامتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ جو کچھ بھی تھا اسی سیاہ غلاف کے اندر باہر تھا اور کہیں بھی کچھ نہ تھا۔

بینڈ باجے کی آوازیں ڈھول کی ابھرتی تانیں اور رخصتی کے گیت، ایک چھوٹی سی دلہن لال رنگ کا، سہاگ کا جوڑا پہنے زیورات سے لدی پھدی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سکھیوں کے سنگ بابل کی دہلیز تک پہنچ کر رک گئی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے چھلکی جا رہی تھیں وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ منتظر کھڑی تھی محبتوں بھری اس محفوظ آغوش کی جو کہ ہمیشہ سے اس کی جائے پناہ تھی۔ وہ آغوش جس کی گرمی میں وہ خود کو محفوظ و مامون سمجھتی تھی دل ہزاروں کی موجودگی میں بھی اسی

مخصوص چاپ کا منتظر تھا۔ آنسوؤں کی شدت کو ضبط کی تھپکیوں سے سلاتے سلاتے وہ تھک چکی تھی۔ مخصوص چاپ اس کے قریب آتی جا رہی تھی اس نے اپنی چھلکتی آنکھوں کو اوپر اٹھایا سامنے وہ محبتوں، شفقتوں بھرا وجود تھا جس سے جدائی کی مشکلیں آن پہنچی تھیں۔ ماں کا چہرہ صبر و ضبط کا پیکر بنا ہوا تھا لرزتے ہونٹ، خاموش نظریں وہ کچھ پڑھ کر اس چھوٹی سی دلہن کو دم کر رہی تھیں۔ پھر وہ مشفقانہ ہاتھ بڑھے اور انہوں نے معصوم دلہن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ماں کے جسم کی حرارت سے اس کا چھوٹا سا جسم پگھلا جا رہا تھا۔ اس پناہ گاہ سے دوری کے احساس سے اس کا نازک ساتن کانپ رہا تھا۔ شام جدائی اتر آئی تھی۔ وہ ان بہت سی محبتوں سے دامن چھڑا کر لپٹتی مہکتی محبتوں کی یادوں کو سینے سے لگائے ہولے ہولے ڈولتے قدموں سے پی کے دیس جانے کی شروعات کر رہی تھی۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے الوداعی نظروں سے اس چمن کو دیکھا جس کا وہ ایک پھول تھی اس نے ڈبڈباتی نظروں سے چمن کے مالی کی طرف دیکھا جو اپنی متاع عزیز اپنے ہی ہاتھوں غیروں کی جھولی میں ڈال کر سر جھکائے ہارا ہوا کھڑا تھا۔ رخصتی کے گیت اسے پردیسی ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ اس لمحے وہ در و دیوار بھی رو رہے تھے جو اس کے ہم نشیں و غمگسار رہے تھے۔ وہ سرخ بیل جس کی چھایا تلے اسے زندگی کے بہترین رنگ برنگے لمحات گزارے تھے، مرجھائی مرجھائی سی کھڑی تھی۔ اس کے سرخ سرخ پھول رخصتی کے لمحے خون کے آنسو رو رہے تھے۔ کیا رخصتی ہی زندگی کی پہچان ہے؟ زیست کی ضرورت ہے۔ کیا تمام عمر یہ رخصتی کے مرحلے ختم نہ ہوں گے۔ کبھی بابل کے دیس سے رخصتی تو کبھی اس مقام لامکاں سے رخصتی اور کبھی اس جہاں فانی سے رخصتی۔ کیا زندگی یونہی رخصتی کی ڈور سے بندھی گزرتی چلی جائے گی بہت دیر غلاف کعبہ سے لپٹی رہی۔ اس کی حرارت سے وجود پگھلا جا رہا تھا۔ وچھوڑے کا دکھ تن کو گھیرے تھا۔ وچھوڑے کی جان لیوا گھڑی آن پہنچی تھی۔ کوچ کے نقارے پر چوٹ پڑ چکی تھی۔ قافلہ واپسی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اندھیرے اجالوں سے گلے مل رہے تھے اجالے الوداع کہتے ہوئے دور ہو رہے تھے۔ شاید منتظر تھے کہ ابھی پیچھے سے بڑھ کر کوئی روک لے گا واپس بلا لے گا۔ اپنے پاس بٹھا لے گا۔ جانے نہ دے گا۔ پاگل دل نہ

جانے کیا کیا ان ہونیاں سوچ جا رہا تھا۔ کیا کیا خواب بن رہا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا کسی نے بھی آگے بڑھ کر دامن پکڑنے کی کوشش نہ کی کسی نے بھی بڑھتے قدموں کو روکنے کا حیلہ نہ کیا۔ قربتیں فاصلوں میں بدلتی گئیں۔ فاصلے جو قرنوں کا عذاب اندر سمیٹے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ روح جدائیوں کے بوجھ تلے دبی سسک رہی تھی۔ شام مسافری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہم پردیسی تھے پردیسی رہے اور پردیسی ہی رہیں گے۔ اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں کوئی گھر نہیں یہ الگ بات ہے کہ ہم ہر ٹھکانے کو اپنا گھر سمجھ لیتے ہیں اس سے دل لگا لیتے ہیں۔ اپنی فانی حقیقتوں کو نظرانداز کر کے لافانی خواہشوں میں جینے لگ پڑے ہیں۔ الوداع اے زندگی کی صداؤ کہ مجبوریوں کا سفر شروع ہو چکا گھسٹتے قدموں' ٹوٹتے بدن کے ساتھ باب وداع سے وداعی ہو گئی۔

اک وچھوڑا سیاں دا جویں ڈاروں کونج وچھنی

ہم رات کو جدہ پہنچے۔ وہ سفر عظیم جس میں ایک پڑاؤ جدہ کا بھی تھا۔ اور یہی پڑاؤ آخری تھا۔ مبارک سفر اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ہم اپنے ناموں کے ساتھ حاجی کا اضافہ کر چکے تھے۔ میرے قافلے کے تمام افراد چمکتے چہرے کے ساتھ وطن واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سامان کی پیکنگ نئی خریداریوں کی لسٹیں بن رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو مبارکبادیں دی جا رہی تھیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ مبارکباد کے جواب میں خوشی کا اظہار کیسے کروں اپنے آپ سے جدا ہو جانے پر اظہار تشکر کیسے کروں۔ مبارکباد ایک حل نہ ہونے والا سوال بن کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کیا حج صرف ایک فرض کا نام ہے جس میں دل کا کوئی دخل نہیں کیا۔ حج صرف ان تمام امور کی انجام دہی کا نام ہے جو ہمارے نبیوں نے انجام دیئے اگر یہ سچ ہے تو پھر اس دل بدبخت کو کیا ہوا یہ کیوں ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ فرض کی انجام دہی کا احساس اسے کیوں سکون نہیں بخشتا یہ اتنا بے سکون کیوں ہے؟ یہ واپسی کے خیال سے کیوں لرزنے لگتا ہے؟ ایسے بہت سے سوال تھے جو اندر سے اٹھ کر مجھے ستا رہے تھے۔ مگر میرے پاس ان کا کوئی حل کوئی جواب نہ تھا۔ ایک عجیب طرح کی کسک تن کو گھیرے تھی میں بظاہر سب کے ساتھ شامل تیاریوں میں مگن تھی اندر کیا کچھ تھا اس سے سب ہی بے خبر تھے۔ ٹی وی پر کوئی عربی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ میں بے خیالی میں ٹی وی کے سامنے

بیٹھی تھی۔ جانے کتنے پل کتنی ساعتیں عالم بے خبری میں گزر گئیں۔ پھر یکایک سماعتوں نے کیا دیکھا کہ چونک پڑیں اور اس طرح بے خبری کا سلسلہ ختم ہو گیا جو شروع تھا۔ میں نے آواز کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں تو ٹی وی پر جا رکیں۔ ٹی وی پر وہی منظر دکھائے جا رہے تھے۔ جن کی نظروں کو پیاس تھی۔ وہی پیغام صبح نو نکل رہا تھا۔ جو قربتوں کی منزلوں کی پہچان تھا۔ وہی سفید سفید چادروں میں لپٹے وجود وہی میدان، وہی وجود کے آرام سے بے خبری کا عالم وہی لبیک وہی ورد وہی حاضری وہی سلام۔ آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں کان ادھر ادھر کے ہنگاموں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ اندھی آنکھیں روشنیوں کے وجود کا سراغ مل جانے پر چمک رہی تھیں۔ آس پاس ارد گرد کچھ بھی نہ تھا۔ اندر باہر ادھر ادھر لبیک ہی لبیک تھا۔ وہ دل میں گھر کر جانے والا لبیک۔ وہ زندگی کو زندگی سے ملا دینے والا لبیک وہ بھٹکتے راہیوں کا راہنما لبیک۔ وہ مسافری کی سوغاتیں بخشنے والا لبیک۔ وہ ہم سب کا لبیک وہ ہمارے جینے کی آس لبیک۔ لبیک جسم و جان میں، روح و دل میں چھن چھن بج رہا تھا۔ بصارتیں گم، بصرتیں غائب، وجود فنا، فنا فنا سب کچھ فنا، قائم و دائم، زندہ و سلامت بصارتوں، بصیرتوں کا سرچشمہ لبیک ٹی وی پر لبیک کے ترانے اور آنکھوں میں لٹ جانے کے ہاڑے کچھ تیرتے کچھ ڈوبتے لمحوں کا عکس۔ کچھ پانے کچھ کھونے کا احساس، جدائیوں کی گھٹا جلتے جسم کی دھرتی پر ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ وہ بنجر تھور زدہ دھرتی اپنے ویران تن کے اجاڑ پن کو سمیٹے اپنی بدبختی پر نازاں تھی۔ وہ رات ٹوٹی ہوئی تھکی ہوئی رات اپنے سیاہ وجود کے بوجھ کو اٹھائے آہستہ آہستہ گھٹ رہی تھی۔ وہ سرزمین حجاز پر ہماری آخری رات۔ وہ خواب و خیال کی پرچھائیوں کے سنگ بیت جانے والی رات۔ وہ امن کی سرزمین پر ہولے ہولے دم توڑتی رات، وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جانے والی رات، وہ رات جو اپنی صبح میں بہت سی محبتوں کے بچھڑ جانے کا پیام لا رہی تھی۔ جس کی صبح میں جدائیوں کی خراشیں تھیں۔ دوریوں کے اندھیرے تھے۔ سامان کی پیکنگ جاری تھی۔ سب اپنے اپنے سامان کو اکٹھا کر کے پیک کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ بھائی نذیر جو اس تمام عرصہ میں ہمارے ساتھ ساتھ رہے ہماری تمام جملہ ذمہ داریوں کو خوبی سے نبھاتے ہوئے ہمیں کسی بھی مشکل میں ڈالے بغیر ہمارے آرام

کے لیے کوشاں اول دن سے آخر دن تک ہمارے ساتھ ساتھ۔ تو اس آخری دن بھی ہماری ساری پیکنگ انہوں نے خود کی۔ وہ تمام رات سامان کی پیکنگ کے مختلف مرحلوں سے گزرتے بیت گئی۔ تھوڑا تھوڑا کرتے بھی خاصے "تبرکات" جمع ہو گئے تھے۔ اور اس وقت ان تمام "تبرکات" کو سمیٹنے کے مرحلے شروع تھے۔ صبح اداس اداس سی تھی۔ چپ چپ تھی۔ ہر طرف خاموشیوں کے راج تھے۔ رونقیں کہیں چھپ کر بیٹھ گئی تھیں۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ وہ لمحے جن کو کبھی جیا تھا۔ وہ محبتوں کے ہزار داستان لمحے سمٹ کر جدائی کا روپ دھار چکے تھے۔ ناشتے کے بعد سفر کا اہتمام شروع ہو گیا سب ساتھی سامان کو ایک جگہ جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ بھائی نذیر افسردہ ہمارے ساتھ تھے۔ مہینہ بھر اپنوں کے ساتھ رہنے کے بعد شاید پردیس کی اجنبیت ستا رہی تھی۔ وہ خاموش سے تھے اور ان کی یہ خاموشی ماحول کو تھکا رہی تھی۔ قاسم بھائی شیو اور غسل سے فارغ ہو کر نئے کپڑے پہنے کافی ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ دوسرے ساتھی بھی نئے کپڑے پہنے حج کا روپ سجائے بیٹھے تھے۔ خالہ عزیز کی فلائٹ ہم سے ایک روز پہلے تھی لہٰذا وہ ہم سے پہلے جا چکی تھیں۔ کاروں کی کھلی بانہیں ہمیں سمیٹنے کو تیار کھڑی تھیں۔ بھائی نذیر کا چھوٹا سا گھر جس نے بارہا ہمیں پناہیں بخشی تھیں خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ جدہ کی گلیاں اور بازار آہستہ آہستہ گزرتے جا رہے تھے۔ ہم محبتوں کی ساری منزلیں ہولے ہولے پیچھے چھوڑ رہے تھے۔ اور اس وقت اس آخری پڑاؤ کو بھی چھوڑ چلے تھے۔ ایئر پورٹ پر گہما گہمی کا عالم تھا۔ ہر طرف حجاج اپنا سامان رکھے بیٹھے تھے اور کچھ لیٹے تھے۔ ان کے چہرے خوشیوں کی سرخی سمیٹے دمک رہے تھے۔ پاکستانی حج ٹرمینل آ گیا تھا۔ اتنا رش تھا کہ بمشکل اندر پہنچ سکے اور پھر سامان کی الٹ پلٹ کاغذوں کی جانچ پڑتال کا سلسلہ چل نکلا۔ ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے اسی دنیا کی جانب لوٹ رہے تھے۔ جس کی وحشتوں سے گھبرا کر بھاگے تھے وہ زمین وہ مقام ہم سے دور ہو رہا تھا۔ جہاں زندگی سے رشتہ جڑا تھا۔

پھٹا پرانا بھاگ اساڈا بھکھ، ٹکڑ سج بیہ
فاقہ کڑاکا منگن پنن چال آساڈی اہ

رچھ رچھوڑتے تیلے کانے ایمہ آساڈی کاروں
میں چوہر ہڑھیڑی آں سچے صاحب دے درباروں

خود کو گھسیٹی، دل کو سنبھالتی بمشکل جہاز تک پہنچی اور میں جہاز پر چڑھنے والی سب سے آخری مسافر تھی۔ دلاسوں کی تھپکیاں امیدوں کے بہلاوے خود کو دیتی۔ بھاری قدموں سے سیٹ تک پہنچی۔ ہمیں خوش آمدید کہا جا رہا تھا۔ مبارک بادیں دی جا رہی تھیں۔ ہمیں خوش نصیب گردانا جا رہا تھا۔ ہمارے نام کے ساتھ حاجی کا با برکت اضافہ ہو چکا تھا۔ میں سن رہی تھی، دیکھ رہی تھی۔ مگر شاید یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کیا واقعی یہ حقیقت ہے میں حاجن ہوں۔ خوش نصیب ہوں مبارک کی حقدار ہوں۔ دل کو حیرت سے ٹٹولتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ سب کچھ وہی تو تھا۔ وہی دل وہی دماغ وہی سوچیں وہی انداز تو پھر اضافہ کہاں ہوا؟ تبدیلیاں کہاں آئیں؟ کہیں دکھائی نہیں دیتیں یہ تبدیلیاں۔ یہ اضافے۔ بلکہ اب تو بہت کچھ بچھڑ چکا ہے۔ جسم کچھ ادھورا ہو گیا ہے خالی خالی جیسے روح ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ جیسے بچھڑ چکی ہے۔ برسوں کی ساتھی دغا دے گئی ـــ چھوڑ گئی ـــ مگر کہاں گئی ـــ؟ ابھی یہ سوالات اٹھ ہی رہے تھے کہ جواب خود بخود مل گیا۔ جہاز کے دوڑتے بھاگتے پہیوں کے شور سے گھبرا کر ناگاہ نیچے نظر پڑی تو اس بے وفا کو کھڑے پایا۔ چمکتا چہرہ، مسکراتی نگاہیں سرتاپا سفید لباس میں لپٹی کتنی مقدس کتنی پاکیزہ۔ ہاتھوں میں موتیئے کی کلیوں کے گجرے اور لبوں پر منزلوں کو پا لینے کی مسکان ـــــــ ہاں وہی تھی۔ میں بڑی حیرت سے اس کی سج دھج دیکھ رہی تھی۔ بڑی خوش نصیب تھی۔ اپنے مقام کو وفاؤں کے بل بوتے پر حاصل کر لیا۔ مبارک ہو تجھے کتنی با نصیب ہے تو۔ میں نے چھلکتے نینوں سے اسے حیرت زدہ لہجے میں تکتے ہوئے کہا اور جب آنکھیں پانی کے بوجھ سے آزاد ہوئیں۔ کچھ تکنے کے قابل ہوئیں تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بڑی جلد باز تھی وہ۔ جلدی جلدی خدا حافظ کہے بنا چلتی بنی وہ کیوں رکتی، کس لیے ٹھہرتی، اس کی منزلیں تو اس کے سامنے تھیں، میں دکھے دل کے ساتھ ان تیرتے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو دھواں دھواں ہو کر جہاز کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ کتنے بے ثبات کتنے کھوکھلے وجود تھے ان کے بالکل میری طرح۔

سفر حج

لبیک	ممتاز مفتی
تمنا بے تاب	محمد سعید شیخ
سفر حرمین شریف	بلقیس ریاض
عرض حال	بشریٰ اعجاز

اسلامی کتب

صراط مستقیم	ثریا عندلیب
آیات بینات	ثریا عندلیب
رسولؐ اللہ کی خارجہ پالیسی	اسد سلیم شیخ
صحابہ کرامؓ اور عشق حبیبؐ کے تقاضے	ڈاکٹر علی اصغر چودھری
نبیؐ اکرام کی مسکراہٹیں	ڈاکٹر علی اصغر چودھری
منصب حکومت اور مسلمان عورت	پروفیسر رفیع الدین شہاب
اسلام کا ازدواجی نظام	پروفیسر رفیع اللہ شہاب
کرایہ مکان کی شرعی حیثیت	پروفیسر رفیع اللہ شہاب
قصاص و دیت	چودھری الطاف حسین
قانون فوجداری مع قصاص و دیت	ملک ریاض خالد
اصول شرح محمدی	سید امیر علی
اصول فقہ اسلام	عبدالرحیم
اسلامی قانون فوجداری	مولوی سلامت علی
قرآن حکیم کا نظریہ علم	ڈاکٹر خواجہ معین الدین
پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں	ڈاکٹر عبدالمجید سندھی
نام —— بچوں کے نام	افضال احمد/اعجاز احمد

ISBN - 969 - 35 - 0570 - 0

Rs. 90.00